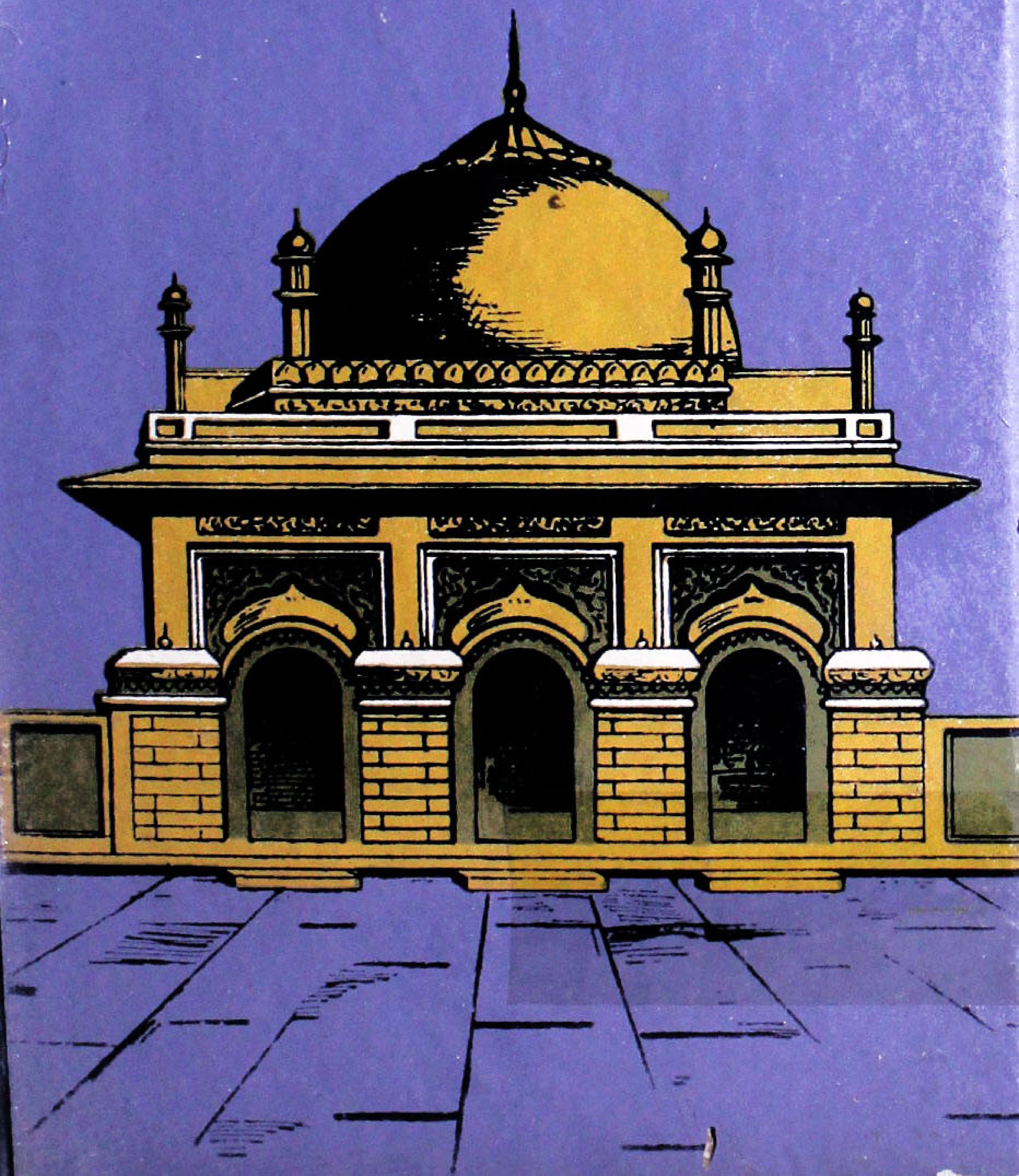
حضرت بوعلی قلندر رحمۃ اللہ



حضرت
بو علی قلندرؒ



اقبال صلاح الدین

سنگِ میل پبلیکیشنز، چوک اردو بازار لاہور

ناشر :- نیاز احمد

سنگِ میل پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور

تعداد :- ایک ہزار

سالِ طباعت :- سنہ ۱۹۷۲ء

قیمت :- ۵ روپے

مطبع :- پنجاب آرٹ پریس - لاہور

مضامین

وفات

تدفین

مزارِ مبارک

۴۔ تصانیف

دیوان

مثنوی

رباعیات

رسالہ سترِ العشق

رسالہ عشقیہ

اسرار العاشقین

مکتوبات

رسالۂ سلوک

رسالۂ توحید

حکم نامہ

۵۔ حضرت بو علی قلندر اور معاصر سلاطین

غیاث الدین بلبن

علاء الدین خلجی

غیاث الدین تغلق

ناصر الدین محمد تغلق

۶۔ ہمعصر مشاہیر

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

خواجہ علاء الدین علی احمد صابریؒ

مولانا جلال الدین رومیؒ

حضرت لال شہباز قلندرؒ

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ

حضرت شیخ کبیر الاولیاءؒ

شیخ فخر الدین عراقیؒ

حضرت امیر خسرو دہلویؒ

حضرت شیخ شرف الدین احمد منیریؒ

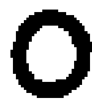
مولانا شمس الدین یحییٰؒ

حضرت شیخ نصیر الدین روشن چراغ دہلیؒ

حضرت خواجہ حسن سجزی دہلویؒ

قاضی ضیاء الدین سنامیؒ

شہزادہ مبارک خاں



پیش گفتار

یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ اور ناخوش گوار ہے کہ مستند اور معاصر کتبِ تاریخ و تذکرہ حضرت بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق حالات و واقعات کے بیان سے یکسر عاری ہیں، جن کے بغیر سوانح نگاری کا حق ادا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ــــــ اس پر مستزاد یہ کہ صاحب سوانح ایک عظیم ہستی ہیں ــــــ مجبوراً مجھے زیادہ تر ان کتابوں پر انحصار کرنا پڑا جو نہ صرف قلندر صاحب کے زمانے سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں بلکہ صدیوں بعد لکھی گئیں۔ مؤلفین نے سابقہ روایات کو بغیر کسی تحقیق و استناد اور حوالے کے نقل کر دیا گیا ہے، جن پر کلّی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان روایات کی پرکھ پرچول عقلی دلائل سے کرنا بسا اوقات بمصداق "عقل نوں کیہہ دخل ایتھے" درست قرار نہیں پاتی۔ لہٰذا بعض مقامات پر محتاط بحثوں کے سوا معاملے کو قارئین کے عرفان و وجدان پر چھوڑ دیا ہے ــــ یا ــــ ان محققین کی کمرِ ہمت پر، جو علم و ادب کی آئندہ آبیاری کریں گے۔ مستقبل سے امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ کسی معاصر اور مستند شہادت کو ڈھونڈ نکالے۔

اگرچہ میں نے جن کتب سے استفادہ کیا ہے، ان کی فہرست کتاب کے آخر

میں درج کر دی ہے، پھر بھی تذکرۂ قصر عارفاں، مفتاح الغیب اور پانی پت اور بزرگانِ پانی پت" کا ذکر یہاں کرنا بھی ضروری جانتا ہوں۔ کیونکہ بہت سی کام کی باتیں مجھے ان تین کتابوں سے ملی ہیں۔

اس کتاب کی تصنیف میں میرے احبابِ گرامی جناب بشیر حسین ناظم ایم اے اور جناب شیخ شمس الحق نے ازراہِ لطف اپنی بیش قیمت کتب مہیا فرما کر میری معاونت فرمائی۔ میں ان دونوں گرامیقدروں کا بیحد ممنون ہوں۔ آخر میں استادِ دانشور جنابِ علامہ غلام قادر لاہوری کے لئے سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے قدم قدم پر مجھے مفید مشورے دیئے اور میری راہنمائی فرمائی۔ جزاہم اللہ

احقر العباد

اقبال صلاح الدین

۲۳ مارچ ۱۹۷۲ء

مقدمہ

قلندر کے معنی

حرفِ "کلندر" کے تحت صاحبِ "فرہنگ آنند راج" لکھتے ہیں کہ کلندر اس کندہ لکڑی کو کہتے ہیں، جو دروازے کے پیچھے اس غرض سے لگائی جاتی ہے کہ دروازہ کُھلنے نہ پائے۔ اس کے علاوہ مجرموں کے پاؤں میں ڈالی جانے والی بیڑیوں کو بھی کلندر کہتے ہیں۔ جس طرح کندہ اور ناتراشیدہ لکڑی کو کلندر کہتے ہیں اسی طرح بعض بے ڈھنگ افراد کو بھی اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کا نام بھی کلندر پڑ گیا، جنہوں نے کار و کوشش اور محنت و مشقت سے جی چُرا کر درویشی اور گدائی کا لباس پہن لیا۔ پہلے پہل یہ نام بڑا مذموم خیال کیا جاتا تھا لیکن اب اسے قابلِ قبول مفہوم مل گیا ہے اور "طریقت" میں اسے بڑا بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ "قلندر" اِسی لفظ کی عربی شکل ہے۔

"قلندر" کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ شخص جسے دونوں جہانوں میں تفرید اور تجرید حاصل ہو اُسے قلندر کہتے ہیں۔ "رسالہ غوثیہ" کا بیان ہے کہ سریانی زبان میں "قلندر" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک ہے۔

ایوانو (IVONOW) اپنی کتاب ٹرُتھ ورشپرز — (TRUTH WORSHIPPERS) کے حاشیہ (صفحہ ۶۰) میں لکھتا ہے کہ میں نے چالیس برس تک بڑی

مغز ماری کی تاکہ "قلندر" لفظ کا مادہ معلوم ہو جائے ۔ اس سلسلے میں میں نے مختلف زبانوں کے ماہرین کے ساتھ مباحثے کئے، لیکن کچھ نتیجہ بر آمد نہ ہوا ۔ فارسی میں لفظ "کلانتر" (بزرگتر) دیکھنے والا، انتظام کرنے والا اور اختیار کرنے والا کے معنی میں مستعمل ہے، لیکن اس لفظ کے زیر بحث حرف "ق" اور اسی طرح کلاں میں "آ" کی تخفیف کی وجہ کو حل نہیں کیا جا سکتا ۔ عربی، ترکی، سنسکرت، ارمنی اور گرجی زبانوں میں کوئی لفظ اس مسئلے کی وضاحت نہیں کرتا ۔ میرا قیاس یہ ہے کہ یونانی زبان کا لفظ کیلیٹر (CALETOR) جس کا مادہ کیلیو (CALEO) بمعنی بلانا یا حاضر کرنا ہے ہشاید عربی لفظ "دعا" کا ہم معنی ہے ۔ اور غالباً قرونِ وسطیٰ میں رائج روسی اصطلاح "کالیکا" (KALIKA) کا مادہ بھی یہی ہو، لیکن جے ۔ اے ۔ بی پامر (PALMAR) کا کہنا ہے کہ یہ اصطلاح قدیم زمانے میں بھی بہت کم مستعمل رہی ہے مگر عصرِ حاضر کی کتب میں تو نظر نہیں آئی ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ادب میں اس لفظ کا استعمال مدت سے متروک ہے، لیکن اس لفظ کو عربی لفظ "داعی" کے معنوں میں استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قلندر عوام کو عبادت گاہوں کی زیارت کی دعوت دیتا ہے ۔

ایوانو (IVONOW) اسی صفحے پر متن میں لفظ "قلندر" کی اصطلاح اور قلندریہ مشرب کی ابتداء کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ مسئلہ بڑا دقیق سا ہے ۔ قلندر کی اصطلاح غالباً دنیائے اسلام سے پہلے کی ہے، جو کسی نہ کسی روپ میں چھٹی صدی ہجری سے قبل فارسی زبان میں مستعمل نظر آتی ہے ۔

یہ بات شاید کسی اہمیت کی حامل نہ ہوگی کہ روس کے دُور اُفتادہ علاقوں میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں عیسائیت کے تعارف کے بعد چند عیسائی زاہدوں کے ایک آوارہ گرد متجانس گروہ نے جنم لیا۔ ایسے ہی جیسے کالیکی پیری خوزئی (KALIKI PERE-KHOZHIYE) قرونِ وسطیٰ کے ادب میں اس قسم کے بیانات بڑی حد تک مسلمان قلندروں کے حالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جس طرح مسلمان قلندر باقاعدگی سے مکہ معظمہ کی زیارت کے لئے روانہ ہوتے تھے، اسی طرح کالیکی بھی بیت المقدس کی راہ لیتے۔ وہ مختلف گروہوں میں دہشت ناک وضع قطع بنائے گھومتے پھرتے تھے ان کی تعداد عموماً چالیس ہوتی تھی۔ لفظ "زبردست" قلندروں کا مُتم بالشان لقب ہے۔ ان کے کچھ افسانے جو مقبولِ عام شاعری میں شامل ہیں، بسا اوقات قلندروں کے جذب و مستی کو ظاہر کرتے ہیں۔

قلندروں کی داستان مختصر طور پر یوں بھی بیان کی جاسکتی ہے کہ یا تو وہ سرزمینِ فارس کے باشندے تھے یا ان کا تعلق ایشیائے کوچک اور عراقِ عجم سے تھا۔ پانچویں صدی ہجری (بمطابق گیارہویں صدی عیسوی) کے آغاز میں جب سلجوقیوں کے حملوں سے عام اقتصادی حالت تباہ ہوگئی، تو وہاں کے لوگ ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ان قلندروں نے غالباً پہلی مرتبہ شام اور پھر سپین کے مختلف علاقوں تک اپنے دائرۂ سفر کو بڑھایا۔ یاس و ناامیدی کی حالت میں انھوں نے مداریوں اور سپیروں وغیرہ کا روپ دھار لیا۔ ظاہرا ان کے گروہوں میں کوئی مرکزی تنظیم نہ تھی، لیکن بہت سے بڑے بڑے صوفی سلسلوں

میں سے کسی ایک کے ایک ساتھ انہوں نے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا۔ خاص طور پر ایسی تنظیموں کے ساتھ جو نسبتہً زیادہ جمہوری تھیں مثلاً قادریہ، رفاعیہ اور نقشبندیہ وغیرہ۔ دسویں صدی ہجری (بمطابق سولہویں صدی عیسوی) میں ایران میں شیعہ تحریک نے غلبہ حاصل کیا تو مذکورہ تمام تنظیمیں یکسر ختم ہو کر رہ گئیں۔"

مشہور عرب تاریخ دان تقی الدین المقریزی (متوفی ۸۴۵ھ بمطابق ۱۴۴۲ء) نے "الخطاط" میں لکھا ہے کہ قلندری درویش تقریباً چار سو برس پہلے یعنی ۴۴۵ھ میں عرب ممالک میں وارد ہوئے۔ تقریباً ۶۱۰ھ بمطابق ۱۲۱۳ء میں پہلا درویش دمشق میں ظاہر ہوا۔ حضرت شیخ محمد حسین چشتی دہلوی مصنف "مطلوب الطالبین" کا بیان ہے کہ قلندریہ سلسلے کے مدار حضرت شاہ حیدر اور حضرت شاہ حسین بلخی تھے۔ مولوی محمد تقی حیدر نے حضرت شیخ عبدالعزیز مکی کو سلسلۂ قلندریہ کا بانی مبانی بتایا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ہے کہ شیخ حسن (متوفی ۷۲۲ھ بمطابق ۱۳۲۲ء) نے قاہرہ کے قریب قلندروں کی ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ شیخ حسن جوالقی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان الملک العادل ان کے سرپرستوں میں سے تھا۔

مردِ قلندر کی تعریف

انسان معرفتِ الٰہی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، تو اسے "سالک" کہا جاتا ہے۔ سالک راہِ سلوک کا مبتدی ہوتا ہے۔ اس منزل سے ذرا آگے بڑھتا ہے تو "عارف" کہلاتا

ہے کیونکہ وہ حال و مکاشفہ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچاننے لگتا ہے۔ اس کے بعد "واصل" کا مقام آتا ہے۔ جبکہ ہستی کا تعین ختم ہو جاتا ہے اور مجاز سے جدائی وقوع میں آتی ہے اور عبودی کا وہم جاتا رہتا ہے۔ "سرِ دلبراں" کے فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ "واصلِ حق" حق ہے کیونکہ وجود ہر مرتبہ میں واجب ہے اور مخلوقات تعینات ہیں۔ جب تک تعین رفع نہیں ہوتا، وصول میسّر نہیں ہوتا چنانچہ واصلِ حق مخلوق نہیں رہتا اور مخلوق کے اثرات اُس پر سے زائل ہو جاتے ہیں۔ پھر جب انسان مقامِ عارف سے عروج کرتا ہے، تو انتہائی مرتبۂ انسانی کو حاصل کرتا ہے جسے "قلندر" کہا جاتا ہے۔ مولوی محمد تقی حیدر فرماتے ہیں:-

(انسان) اپنے آئینۂ ذاتی کو اپنے آئینۂ وہمِ کامل میں بصورتِ اسماء و صفات و ہیئت عوالم و اشیاء ملاحظہ کرتا ہوا اور اس سے اپنی ذاتِ حقہ کا یقین حاصل کرتا ہوا، اپنے آخری مرتبۂ نزول یعنی مرتبۂ انسانی میں پہنچ جاتا ہے اور لباسِ عبودیت زیبِ تن کرتا ہے۔ یہاں پر اس کو نزول و عروج ایک ہو جاتا ہے اور وہ لاہوت کو ناسوت اور ناسوت کو لاہوت میں دیکھتا اور کل میں جزو اور جزو میں کل کا مشاہدہ کرتا ہے اور خود اپنی جنبِ وجود میں لاہوت و ناسوت و جزو و کل سب سے مستغنی رہتا ہے اور ہر وقت اپنے کمال سے ایک طرح کے سرور میں

رہتا ہے، جس کو "حیرتِ محمودہ" کہتے ہیں اور اس مقام بے مقامی میں اُس کو انسانِ کامل، عارفِ تام المعرفت اور قلندر کہتے ہیں۔

حضرت سید اشرف سمنانی فرماتے ہیں کہ قلندر وہ ہوتا ہے، جو علائق روزگار سے مجرد ہو کر ظاہری اور باطنی تجرید حاصل کر چکا ہو۔ شریعت اور طریقت میں کامل ہو، یعنی شریعت اور طریقت میں اُس سے کوئی فرد گذاشت سرزد نہ ہوتی ہو اور وہ ہر وقت بحرِ وجود اور دریائے شہود میں غرق رہتا ہو۔ محمد حسین تبریزی کے نزدیک قلندر ایک ایسا انسان ہوتا ہے، جو روحانیت میں اس مرتبے پر پہنچ جاتا ہے کہ معاشرتی اور مروّج امتناعات سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کی ذات دنیا سے بے تعلق ہوتی ہے اور وہ جلال و جمالِ الٰہیہ کے تصوّر میں پوری طرح محو ہوتا ہے۔ "عوارف المعارف" کے مصنّف کا بیان ہے کہ مردِ قلندر کسی خاص وضع و قطع کا پابند نہیں ہوتا۔ اُسے یہ پروا نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اُس کا احوال جانے۔ وہ اپنے من کی موج میں مگن رہتا ہے۔ محویت ہی اس کا کُل سرمایہ ہوتا ہے۔

"نفحات العنبریہ" کے مولف نے "مقصود الطالبین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:۔

"قلندر وہ ہے جو نقوش و اشکالِ عادتی و آمالِ بے سعادتی سے مجرّد و باصفا ہو گیا ہو، اور جس نے مرتبۂ روحی پر ترقی کر کے قیودِ تکلفاتِ رسمی و تعریفاتِ اسمی سے خلاص ہو کر خطِ کونین سے منہ پھیر لیا ہو اور سب کو حق سے حق کے لئے دیکھتا ہو، اور اپنے آپ کو سب سے

منقطع کرکے عاشقِ جمالِ ذوالجلال ہو رہا ہو اور اس مرتبہ پر فائز ہو کر قیودِ نفس وعقل سے خلاص ہو کر نشاط و انبساط و اشارت و بشارت سے بے تعلق ہو گیا ہو۔"

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں کہ فرقۂ قلندریہ کو ایسا طیبِ قلب اور سرور و حضورِ حق حاصل ہوتا ہے اور ان پر سکرِ حال اور باطنی مستی اس قدر غلبہ کرتی ہے کہ ان کے ظاہری اعمال یعنی نوافل و آدابِ تناولِ لذات وغیرہ میں قلت ہو جاتی ہے۔ وہ محض سرور و حضورِ باطنی پر ہی اکتفا کرتے ہیں مگر ترکِ فرائض نہیں کرتے۔

اب ہم ذیل میں چند مشہور صوفی اور قلندر مشرب شعرار کے کلام میں سے ایسے اشعار درج کرتے ہیں کہ جن میں قلندرانہ مشرب اور عظمت و شوکت کو نظم کیا گیا ہے:

(۱)

قلندر پرتوِ نورِ الٰہی ست — قلندر مطلعِ انوارِ شاہی ست
قلندر را مقامِ کبریائی ست — قلندر دُرِّ بحرِ آشنائی ست
قلندر موجِ بحرِ لایزالی ست — قلندر نورِ شمعِ ذوالجلالی ست
قلندر قطرۂ دریای عشق است — قلندر ذرّۂ صحرای عشق است
قلندر سرّے از اسرارِ بیچون — قلندر از ہوا و حرص بیرون
قلندر سایۂ پروردگار است — قلندر محض ذاتِ کردگار است

قلندر را نباشد کفر و ایمان　　قلندر را نباشد علم و ایقان

قلندر را نباشد خان و مانے　　قلندر را نباشد این و آنے

قلندر را نباشد آرزوئے　　قلندر را نباشد تارِ موئے

قلندر را نباشد ابتدائے　　قلندر را نباشد انتہائے

قلندر از ہمہ بیزار باشد　　قلندر مخزنِ اسرار باشد

قلندر بے زبان و بے مکان است　　قلندر را نشانِ بے نشان است

قلندر ہست دریای معانی　　قلندر ہست مردِ لا مکانی

قلندر قلزمِ توحید باشد　　قلندر چشمۂ تفرید باشد

قلندر از ہمہ مذہب برون است　　قلندر را نداند کس کہ چون است

قلندر را نباشد ہیچ دینے　　قلندر را نباشد حرص و کینے

قلندر کو مبرّا از خودی شد　　قلندر غرقِ بحرِ بے خودی شد

قلندر خرقۂ از عشق دوزد　　قلندر خرقۂ کونین سوزد

قلندر را علم از عشق باشد　　قلندر را قدم از صدق باشد

قلندر فارغ از کون و مکان است　　قلندر را نمی دانم چسان است

قلندر مرغِ لاہوت است، اے دوست　　قلندر بازِ جبروت است، اے دوست

قلندر کسوتِ مردم گزیند　　قلندر را بہ عالم کس نہ بیند!

قلندر گاہ پنہان گاہ پیدا　　قلندر گاہ صورت گاہ معنیٰ

قلندر ہر زمان اندر شہود است — قلندر ہر زمان در ہست و بود است
قلندر ہر زمانے غرقِ نور است — قلندر دائما اندر ظہور است
قلندر گہ تجلّی کرد بر طور — قلندر داد موسیٰ را ہمہ نور
قلندر لی مع اللہ گفت در راز — قلندر با حبیب اللہ دمساز
قلندر گہ در آمد در دلِ یار — قلندر گہ بر آمد بر سرِ دار
قلندر را تجلّی ہست بسیار — قلندر می نماید بس نمودار
قلندر گہ بہ شکلِ آدم آمد — قلندر گہ بہ نازِ آدم آمد
قلندر گہ حبیب اللہ باشد، — قلندر گہ خلیل اللہ باشد
قلندر شجرۂ این پست و بالا — قلندر ذاتِ پاکِ حق تعالیٰ

قلندر شو کنون احمد قلندر
قلندر را ہمین کار است بہتر

(حضرت شیخ احمد جام)

(۲)

اے بے خبر چہ پرسی از مذہبِ قلندر — بر حق بود انا الحق در مشربِ قلندر
اہلِ حقیقت است او قائل بہ وحدت است او — حرفِ دوئی نشنوی کس از لبِ قلندر
او بگذرد ز ہستی، گو شد بہ حق پرستی — جز نورِ حق نتابد در کوکبِ قلندر
روزش حضور با حق، شب غیبت ست از خلق

زندگے عجیب دارد روز و شب قلندر

(حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ)

(۳)

قلندر کے بیاید در عبارت
قلندر کے بگنجد در اشارت

(حضرت شاہ حسین بلخیؒ)

(۴)

زمین و آسمان ہر دو شریعت اند
قلندر را درین ہر دو مکان نیست
نظر در دیدہ ہا ناقص فتادہ
وگرنہ یارِ من از کس نہان نیست

(خواجہ گیسو درازؒ)

(۵)

اندر رہِ عشق نتوان رفت ... نادیدہ رہِ قلندری نتوان رفت
خواہی کہ پس از کفر بیابی ایمان ... تا جان ندہی بہ کافری نتوان رفت

(حضرت سید محمد بن جعفر مکیؒ)

(۶)

مجرّد شو از دین و دنیـــا ، قلندر

کہ راہِ حقیقت ازین ہر دو برتر

(حضرت خواجہ مسعود بکؒ)

(۷)

تا صومعہ و مدرسہ ویران نشود　　این کارِ قلندری بسامان نشود

تا ایمان کفر و کفر ایمان نشود　　یک بندہ حقیقۃً مسلمان نشود

صنارۂ قلنـــدر سزوار بمن نمائی

کہ بیسے دراز دیدم رہ و رسم پارسائی

(شیخ فخر الدین عراقیؒ)

(۸)

بر درِ میکدہ رندانِ قلنـــدر ہستند

کہ ستانند و دہند افسرِ شاہنشاہی

خشت زیرِ سر و بر تارکِ ہفت اختر پای

دستِ قدرت نگر و منصبِ صاحب جاہی

(خواجہ حافظ شیرازیؒ)

(۹)

بر درِ میکدہ رندانِ قلندر باشیم
کہ ستانیم و دہیم افسرِ شاہانِ عظام

(نامعلوم)

(۱۰)

وقتِ آن شیرینِ قلندر خوش کہ در اطوارِ سیر
ذکرِ تسبیح و ملک در حلقۂ زنار نیست

(شاہ گلشن نقشبندی مجددیؒ)

(۱۱)

ما ز دریائیم و دریا ہم ز ماست
این سخن داند کسے کو آشناست

(محمد قلندر صاحبؒ)

(۱۲)

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش

اگرچہ سر نتراشد، قلندری داند

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

قلندر جز دو حرف "لا الٰہ" کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

قلندر میلِ تقریرے ندارد
بجز این نکتہ اکسیرے ندارد
ازان کشتِ خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خونِ شبیرے ندارد

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا باندازِ محرمانہ
سکندری ہو، قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسّر تو نگری سے نہیں

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہُوا
قلندری سے ہُوا ہے تونگری سے نہیں

ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہُوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی

مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن روایت ہے کہ آخر
اِک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے زمانے میں قلندروں کا طریق
یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے، لیکن کماں سے دور نہیں

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ
یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
یک رنگی و آزادی، اے ہمتِ مردانہ
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد
کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

(علامہ محمد اقبال ؒ)

مشہور قلندریہ سلسلے

تذکرہ "قصرِ عارفاں" نے حسب ذیل بڑے بڑے قلندریہ سلسلوں کا ذکر کیا ہے :۔

باتی سلسلہ	نام سلسلہ
حضرت سید خضر رومیؒ	۱۔ قلندریہ چشتیہ خضریہ
حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ	۲۔ قلندریہ چشتیہ شرفیہ
حضرت سید شاہ نعمت اللہ کرمانشاہیؒ	۳۔ قلندریہ نعمتیہ کرمانیہ
حضرت سید جمال الدین مجرد ساوجیؒ	۴۔ قلندریہ جمالیہ ساوجیہ
حضرت شاہ مرتضیٰؒ	۵۔ قلندریہ سہروردیہ مرتضویہ
حضرت سید شاہ عبدالرسول بہادر پوریؒ	۶۔ قلندریہ سہروردیہ رسولیہ
حضرت شیخ حیدر ترکستانیؒ	۷۔ قلندریہ حیدریہ ترکیہ
حضرت شاہ محمد شریف ناولیؒ	۸۔ قلندریہ شریفیہ ناولیہ

آئندہ صفحات میں سلسلۂ قلندریہ چشتیہ شرفیہ کے بانی حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ ابن سالار فخرالدین عراقی کے سوانح حیات مجمل طور پر بیان کریں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

سوانح

حضرت بو علی قلندرؒ

خاندان

حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندرؒ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی سالار فخر الدین عراقی تھا۔ آپ کرمان کے نواحی علاقوں کے رہنے والے تھے۔ خزینۃ الاصفیاء اور سیر الاقطاب کے مطابق آپ کا نسب نامہ حسبِ ذیل ہے :۔

"شیخ شرف الدین بو علی قلندر بن سالار فخر الدین بن سالار حسن بن سالار عزیز بن ابا بکر غازی بن فارس بن عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم بن محمد بن دانک بن امام نعمان ابو حنیفہ کوفی بن ثابت بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین"

"قصرِ عارفان" میں مولوی احمد علی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت امام اعظمؒ کا نسب شریف مشہور بادشاہ عادل نوشیروان کیانی سے ملتا ہے۔

سالار فخر الدین کے قبیلے کو ایک مرتبہ تاتاری کافروں کے ساتھ جنگ کرنی پڑی، جس میں ان کے قبیلے کو تاتاریوں پر فتح حاصل ہوئی تو اس وقت سے اس خاندان کا لقب

"سالار" مشہور ہُوا۔ یہ لقب حضرت بو علی قلندرؒ کے والد سالار فخرالدین تک اِس خاندان کا طرّۂ امتیاز نظر آتا ہے، لیکن سالار فخرالدین کے بعد کسی فرد نے یہ لقب اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کیا۔

سالار فخرالدین حضرت شاہ محمد کرمانیؒ سے ارادت اور عقیدت رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر بیعت کی اور پھر روحانی منازل طے کرنے کی غرض سے چودہ برس تک مسلسل ریاضت اور مجاہدے کی زندگی بسر کی۔ انہوں نے روحانی اعتبار سے اس قدر بلند مراتب حاصل کئے کہ شاہ کرمانیؒ کے منظورِ نظر ہو گئے۔ شاہ کرمانی نے اپنی ہمشیرہ محترمہ حضرت بی بی حافظ جمال کا نکاح سالار صاحب سے کیا، جن کے بطن سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئے۔

ایک ضروری صراحت

شیخ محمد بن احمد مصنف شرف المناقب کی طرح بعض دوسرے تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے بھی حضرت بو علی قلندرؒ کے والدِ ماجد کا نام لکھتے وقت سالار فخرالدین عراقی کی بجائے شیخ فخرالدین عراقی لکھ دیا ہے۔ اور بعض نے کہیں انہیں شیخ فخرالدین اور کہیں سالار فخرالدین لکھ کر ابہام کی صورت بھی پیدا کر دی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوں کے نام اور ریاضت و مجاہدہ جیسی مشترک قدروں کی وجہ سے اس غلطی کی ابتداء ہوئی اور جو بعد کے سوانح نگاروں کے ہاں روایۃً چلی آتی۔ تذکرہ

اولیائے کرام میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے بھی کسی ایسی ہی غلط روایت کا سہارا لیتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"آپ کے والدِ ماجد ۶۰۰ ہجری میں عراق سے ہندوستان آئے ۔ وہ بڑے متبحر اور جید عالم تھے۔ اُن کی پہلی شادی حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا (زکریا) ملتانی کی دختر نیک اختر سے ہوئی، لیکن وہ لاولد فوت ہو گئیں۔ ان کے بعد مولانا سید نعمت اللہ صاحب ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ بی بی حافظ جمال سے عقد ہوا، جو حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کی ماں تھیں۔"

حالانکہ اس سے پہلے کی سطور میں سلسلۂ نسب لکھتے ہوئے انہوں نے شیخ شرف الدین بوعلی قلندر بن سالار فخر الدین لکھا ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ سید صباح الدین صاحب کے علم میں یہ بات بخوبی ہوگی کہ شیخ فخر الدین عراقی نہ تو خود کبھی سالار رہے اور نہ ہی ان کے آباؤ اجداد کا یہ شغل رہا بلکہ انہیں تو کسی بھی تاریخ دان یا تذکرہ نویس نے سالار نہیں لکھا یہی نہیں سید صاحب نے اس اقتباس میں ایک اور بڑی فروگذاشت بھی کی ہے کہ حضرت بوعلی قلندر کی ماں حضرت حافظ جمال مولانا سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ تھیں۔ گزشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد کرمانی کی بہن تھیں۔ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی تو شاہ کرمانی کی اولاد میں سے تھے۔ تاریخی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کا زمانۂ حیات بہت بعد کا ہے۔

۔ اگرچہ شیخ فخر الدین عراقی کے حالاتِ زندگی حضرت بوعلی قلندر کے ہمعصر مشاہیر کے

باب میں درج کئے جائیں گے، لیکن اس غلطی کے ازالے کی خاطر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں ایک دو باتوں کا بیان یہاں بھی کر دیا جائے۔

حضرت بو علی قلندر کا سالِ ولادت ۶۰۲ ہجری ہے اور اس پر سب کو اتفاق ہے۔ اس کے برعکس شیخ فخر الدین عراقی کی تاریخِ پیدائش ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ اِس مسئلے کے باوجود اُس حقیقت پر کچھ حرف نہیں آتا، جس کا تعلق دونوں کے ہم عمر معاصر ہونے سے ہے۔ قصرِ عارفاں اور دیباچہ عشاق نامہ میں لکھا ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی ۶۸۸ ہجری میں بعمر ۸۲ سال فوت ہوئے۔ اس حساب سے اُن کی ولادت کا سال ۶۰۶ ہجری ہُوا۔ مرحوم سعید نفیسی نے کلیاتِ عراقی کے دیباچے میں ان کا سال پیدائش ۶۱۰ ہجری قرار دیا ہے ـــــ شیخ صاحب ۶۰۶ ہجری پیدا ہوئے ہوں یا ۶۱۰ ہجری میں، بہر صورت یہ دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ حضرت بو علی قلندر سے عمر میں چند سال چھوٹے ہی تھے اور قلندر صاحب ان سے پہلی صورت میں چار سال اور دوسری صورت میں آٹھ سال بڑے تھے۔ دونوں کی عمر کے اس معمولی فرق کو مدِنظر رکھتے ہوئے، اگر ہم انہیں ہم عمر نہیں کہہ سکتے، تو ہمعصر ضرور کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی حضرت بو علی قلندر کے باپ ہرگز نہ تھے۔ جہاں تک حضرت بو علی قلندر کے والد سالار فخر الدین کی برصغیر میں آمد کے زمانہ کا تعلق ہے، ہمیں سید صاحب سے کلّی اتفاق ہے، لیکن شیخ فخر الدین عراقی مرید حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ورود کی تاریخ یہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ۶۰۰ ہجری میں تو وہ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔

بالکل یہی فروگزاشت سید محمد میاں صاحب کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ دونوں معاصر محققین نے یہ غلطی شیخ محمد بن احمد مصنّف "شرف المناقب" سے مستعاری ہے کیونکہ ایک تو شیخ محمد بن احمد کو حضرت بوعلی قلندر کے برادرِ بزرگ شیخ نظام الدین کی اولاد میں سے ہونے کا شرف حاصل ہے۔ دوسرے ان کی کتاب حضرت قلندر صاحب ہی کے حالات و واقعات اور مناقب پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا نام آپ ہی کی نسبت سے "شرف المناقب" رکھا گیا ہے۔ اِن دو باتوں کی وجہ سے بعد کے بیشتر تذکرہ نگاروں نے شرف المناقب اور اس کے مصنف کے پیش کردہ تقریباً تمام بیانات کو مستند اور معتبر جانا ہے۔



سالار فخر الدین کی برِصغیر میں آمد

شیخ محمد بن احمد فرماتے ہیں کہ شیخ فخر الدین عراقی کی اہلیہ جو بقول اُن کے حضرت خواجہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی صاحبزادی تھیں، فوت ہو گئیں تو وہ ملتان سے ہمدان چلے گئے اور وہاں حضرت سیّد نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی بہن سے شادی کر لی۔ شیخ فخر الدین شادی کے بعد ہمدان سے عراق چلے گئے، جہاں اُن کے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام نظام الدین رکھا گیا۔ اِس فرزند کی پرورش عراق ہی میں ہوئی۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں نظام الدین بغرضِ تجارت ہندوستان چلے آئے اور یہاں آکر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی۔ ایک مرتبہ آپ پانی پت میں کسی

غرض سے تشریف لائے اور اس شہر کے خوشگوار ماحول اور اس کے اِرد گِرد کے سبزہ زاروں کی وجہ سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے والدین بھی اُن کی وجہ سے عراق سے پانی پت تشریف لے آئے۔

اس کے برعکس قصرِ عارفاں کے مؤلف مولوی احمد علی لکھتے ہیں کہ سالار فخر الدین کے صاحبزادے شیخ نظام الدین کو حضرت شاہ محمد کرمانی نے اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔ شیخ نظام الدین بڑے ہوئے، تو سندھ کے علاقے میں چلے آئے۔ پھر کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد مشرقی ہندوستان کے علاقوں میں وارد ہوئے اور یہاں شاہی رسالے میں ملازمت اختیار کر لی۔ شیخ نظام الدین عراقی کو ہندوستان آئے کئی سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں وہ کسی وجہ سے وطن نہ جا سکے۔ بیٹے کی طویل جدائی کی وجہ سے والدین کو پریشانی لاحق ہوئی۔ بیٹے کا فراق میاں بیوی کو کشاں کشاں ہندوستان لے آیا۔ ہندوستان آکر انہوں نے پانی پت میں رہائش اختیار کر لی۔

اگرچہ مولوی احمد علی صاحب نے اپنی بیان کردہ روایت کے مآخذ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روایت قوی ہے اور شیخ محمد بن احمد کا بیان بےحد کمزور ہے کیونکہ ان کے پیشِ نظر شیخ فخر الدین عراقی ملتانی ہیں۔ حضرت بوعلی قلندر صاحب کے والد سالار فخر الدین عراقی نہیں۔ لہٰذا قلندر صاحب کے والد محترم کی ہندوستان میں آمد سے متعلق ان کے بیان کئے ہوئے دوسرے واقعات پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

پانی پت

شہر پانی پت ضلع کرنال میں واقع ہے۔ ۱۸۵۴ء تک پانی پت ہی ضلع کا صدر مقام تھا۔ اس کے بعد سے تحصیل کا صدر مقام ہے۔ یہ شہر دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر دہلی سے تقریباً ۵۲ میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ دہلی انبالہ کالکا ریلوے لائن اسے دوسرے شہروں سے ملاتی ہے۔ پانی پت اپنی قدامت کے اعتبار سے برصغیر کے دوچار قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اس کی تہذیب و تمدّن اور تاریخ کے آثار قریباً ساڑھے تین ہزار سال پرانے ہیں۔ اس شہر کا ذکر "مہا بھارت" میں بھی ملتا ہے۔ ہندو روایات کے مطابق پانی پت اُن پانچ مقامات میں سے ہے جو کہ یودھشٹر انے امن کی قیمت کے طور پر دریودھانا سے مانگے تھے۔

اسلامی عہد میں اس شہر کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ برّصغیر کی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات پانی پت میں رونما ہوئے۔ مثلاً ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے اس شہر کو پامال کیا۔ بہلول لودھی کے زمانے میں پہلے اس کے بیٹے نظام خاں نے پانی پت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کے دوسرے بیٹے سکندر لودھی نے غلبہ حاصل کر کے اس شہر کو اپنا صدر مقام بنایا۔

پانی پت کے میدان میں شمالی برِّصغیر کی تین فیصلہ کن لڑائیاں لڑی گئیں، جنہوں نے پورے علاقے کی سیاسی حیثیت یکسر بدل کے رکھ دی۔ ان میں سے سب سے پہلی

لڑائی ۱۵۲۶ء میں ظہیر الدین بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی۔ اس معرکے میں بابر فتح مند ہوا، جس نے اس فتح کے فوراً بعد دہلی اور آگرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح دریائے اٹک سے بنگال تک کے وسیع علاقے پر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی لودھی حکومت کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ اکبر اعظم کے سردار بیرم خاں اور عادل شاہی ہندو جرنیل ہیمو بقال کے مابین ہوئی۔ اس جنگ میں بھی مغل افواج کو فتح حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں مغلیہ خاندان کی حکومت کو دہلی اور آگرہ وغیرہ کے علاقوں میں دوبارہ استحکام حاصل ہوا اور ہندی افغانوں کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ پانی پت کی تیسری مشہور لڑائی احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کے درمیان ۱۷۶۱ء میں لڑی گئی۔ اس لڑائی میں احمد شاہ نے مرہٹوں کی کمر توڑ کے رکھ دی اور پھر اُن کے دل میں حکمرانی کا خیال کبھی نہ آیا۔ سردار محمد یعقوب خاں نے پروفیسر براؤن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اگر مرہٹے اس لڑائی میں کامیاب ہو جاتے تو مسلمانوں کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔"

۱۷۶۷ء میں بھی پانی پت میں ایک جنگ سکھوں اور شہنشاہِ دہلی کے درمیان بھی ہوئی۔

۱۸۰۳ء میں انگریز جنرل پران (PERRON) نے پرگنہ پانی پت کو مرہٹوں سے ہتھیا لیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک برِ صغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح پانی پت بھی انگریزوں کی عملداری میں رہا۔

سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ پانی پت کو ایک علمی اور مذہبی مقام کی حیثیت سے بھی زبردست شہرت حاصل ہے۔ اس مادرِ علمی نے بڑے بڑے نامی علماء و فضلاء اور عظیم صوفیاء کو جنم دیا، جن کی بدولت یہ شہر اسلامی علوم کا گہوارہ بن گیا۔ ایک زمانے نے اس مرکز سے کسبِ فیض کیا اور اپنی علمی اور روحانی تشنگی کو سیراب کیا۔

بیشک برصغیر میں اسلامی اقدار کے فروغ میں پانی پت کو بڑا بلند مقام حاصل ہے مگر اب پانی پت کی حالتِ زار کا جو نقشہ ہے، مولانا سید محمد میاں صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

"دنیا کی چشمِ حیرت نگار نے ۱۹۴۷ء جیسا کوئی انقلاب نہیں دیکھا ہوگا کہ نہ دو بادشاہتوں میں تصادم ہُوا، نہ حاکم اور محکوم کے آپس میں خونریزی ہوئی، حکمران محفوظ، فوجیں محفوظ، مگر پنجاب و بنگال کے عوام تباہ و برباد، اس انقلاب نے پانی پت کا بھی روپ بدل دیا۔ تقریباً پچاس ہزار کی مسلم اقلیت شہر بدر، مسجدیں ویران، مدرسے برباد مقابر و مزارات تباہ۔ جس شہر میں ہزاروں حافظِ قرآن اور نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی حافظِ قرآن ــــــــ اب مسلمانوں کی تعداد چند سو تک پہنچ چکی ہے، لیکن ایک مسجد کے علاوہ باقی تمام مساجد ویران پڑی ہیں۔ یا دوسروں کے قبضہ میں ہیں۔ اس طرح مقدس مزارات کے گنبد اور حجرے رہائشی مکان بنے ہوئے ہیں۔"

پیدائش، نام اور لقب

اسی مردم خیز سرزمینِ پانی پت میں حضرت بوعلی قلندر کی مبارک ذات کا ظہور ہُوا۔ آپ کی ولادت کا سال ۶۰۲ ہجری ہے۔ قصرِ عارفاں میں لکھا ہے کہ "زہے شرف" کے حروف سے آپ کی پیدائش کا سال نکلتا ہے۔ بعض دوسری کتب میں بھی یہی مادہ تاریخ درج ہے۔

آپ کی پیدائش سے متعلق "مفتاح العیب" میں لکھا ہے کہ:۔

"جب قلندر صاحب پیدا ہوئے، تو آپ نے رونا شروع کیا، اور مسلسل تین دن روتے رہے، دودھ مطلق نہ پیا اور آنکھ نہ کھولی۔ جب تین دن گزر گئے، تو شیخ فخرالدین عراقی (جو مفتاح العیب کے مطابق قلندر صاحب کے والد تھے) گھر سے باہر تشریف لائے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مست فقیر چمڑا اوڑھے دروازہ پر کھڑا ہے۔ ان سے مصافحہ کیا۔ فقیر نے کہا، اے شیخ! تیرا تجھے صاحبزادہ مبارک ہو، اُسے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ شیخ موصوف درویش کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ جب اُس صاحبِ کمال فقیر نے اُس نورِ حقانی کو دیکھا تو اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور یہ آیتِ کریمہ اُن کے کان میں پڑھی فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اسی وقت رونا بند ہوگیا اور آپ دودھ پینے لگے۔ اس سے ثابت ہوتا

ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے اور فرمانِ خداوندی کا احترام اور ادب آپ کی سرشت میں ازل سے موجود تھا کہ آپ آیتِ کریمہ سنتے ہی خاموش ہو گئے۔ درویش نے فرمایا، اے شیخ! تیرا صاحبزادہ عاشقِ الٰہی ہے عاشقوں کا بھید کسی سے کہنا نہیں چاہیئے۔ اتنی بات کہہ کر وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔"

مؤلفینِ مفتاح نے اِس روایت کے ماخذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ البتہ اُنھوں نے اس روایت میں آنے والے مردِ درویش کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مولانا جمال قلندر چرم پوش رحمتہ اللہ علیہ تھے، جن کا مزار دریائے اٹک کے کنارے شہر اٹک کے نزدیک واقع ہے۔

المختصر آپ کے والدین نے آپ کا نام شرف الدین رکھا۔ عوام و خواص میں آپ بوعلی قلندر کے نام سے مشہور ہوئے۔ بوعلی کے علاوہ آپ کو عاشقِ الٰہی، بخشیِ ہند اور قتال وغیرہ کے القابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ تذکروں میں آتا ہے کہ بوعلیؒ کا لقب انہیں روحانی طور پر امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے عنایت فرمایا تھا جبکہ لقب "بخشیِ ہند" اُنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بارگاہِ عالی سے عطا ہُوا تھا اور حضرت شاہ جمال قلندر چرم پوش نے "عاشقِ الٰہی" کا خطاب دیا۔ "قتال" کے لقب سے متعلق مشہور ہے کہ یہ لقب عوام نے آپ کو دیا تھا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قلندر صاحب کے ایک بھائی تھے، جو عمر میں ان سے

بڑے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی دو بہنیں تھیں، جن میں سے ایک کے بارے میں بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ اُن کی شادی جمال الدین ہانسوی سے ہوئی اور وہ صاحب اولاد ہوئیں دوسری صاحبزادی کے بارے میں سبھی تذکرے خاموش ہیں۔

تعلیم

حضرت بوعلی قلندر کی تعلیم سے متعلق تفصیلات نہ ہونے کے برابر ملتی ہیں۔ البتہ اُن کی منظوم اور منثور تصنیفات کے مطالعہ کے بعد ہم بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ قلندر صاحب کو متداول علوم پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔

عربی اور فارسی زبانوں پر اُنھیں پوری دسترس اور قدرت حاصل تھی۔ وہ قرآنی آیات، احادیث، عربی عبارات اور تراکیب بلاتکلف استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً حسب ذیل فارسی غزل قلندر صاحب کی عربی زبان میں مہارت پر دال ہے:

جعدت دراز و قامتِ زیبا و رویِ خوب
نادیدنش گناہ بود، اے غافرالذنوب

گر عیب من ہمینست کہ عشقت گزیدہ ام
بخ بخ و آن یزید عیوباً علی العیوب

وردر قلندری بہ ملامت مثل شدم
یارے بخود نمودہ پسر سالب القلوب

اہلِ ملامتم ، شکیبم ز طاعنان
لو رقّت القلوب فقد شقّت القلوب
آن گوہرِ کمال ز بحرِ قلندری
کس جوہری نبود مگر عالم الغیوب
مستغرقِ شمائلت اندر تحیرم
کز جانبِ شمال ندانم سوی جنوب
من عاشقِ شگوفہ و بادِ صبا شدم
کو چون تو در تبسم و آن بر تو در ہبوب
طال الفراق واحترقت لی ترائب
من لوبتہ التعشّق یا کاشف الکروب
تخمے کہ کاشت بو علی اندر دلش زعشق
تو بر شگاف و نخل کن، اے فالق الحبوب

قلندر صاحب چونکہ قرآن پاک کے حافظ اور عاشق تھے، اس لئے آپ نے عربی زبان کی طرف خاص توجہ دی۔ صرف و نحو، فقہ و حدیث اور تفسیر و تشریح جیسے علوم بڑی محنت سے سیکھے۔ عربی کتب کا مطالعہ بڑی کثرت اور دلچسپی کے ساتھ کیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ دہلی کے اکابر علماء مولانا قطب الدین، مولانا وجیہہ الدین پائلی، قاضی ظہور الدین بخاری، قاضی حمید الدین صدرِ شریعت اور مولانا فخر الدین پاٹلی وغیرہ ان کے

علمی تبحر اور فضیلت کے معترف تھے ۔

بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کو عربی زبان میں شعر کہنے کا بیحد ملکہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمیں ان کا کوئی دیوان یا باقاعدہ منظوم تصنیف عربی زبان میں نہیں مل سکی ۔

عربی اور فارسی کے علاوہ آپ کو ہندوی زبان میں بھی درک حاصل تھا ۔ آپ کے کچھ دوہرے مختلف تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں ، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بوعلی اچھے خاصے ہندوی دان بھی تھے ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم فرہنگِ آصفیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں : ۔

"ہجری ساتویں صدی بعہدِ محمد تغلق شاہ اور علاء الدین خلجی ، جس زبان کا رواج تھا ، اُس کی اِس دوہے سے ، جو حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر صاحب کی زبانِ مبارک سے مبارز خاں صاحب کے ارادۂ سفر کے موقع پر نکلا ، کیفیت معلوم ہوتی ہے" :

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے رُوئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدی نہ ہوئے

اسی مضمون کو آپ نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے : ۔

من شنیدم یارِ من فردا رَوَد راہ شتاب
یاالٰہی ، تا قیامت بر نیاید آفتاب "

حضرت قلندر صاحب کا ایک اور فارسی شعر ہے :

پردہ بردار کہ تا عارضِ زیبا نگریم
ورنہ از آہِ جگر پردۂ عالمؑ بدریم

اس شعر کا مضمون بھی اُنھوں نے اپنے ذیل کے دوہرے میں ادا فرمایا ہے :

گھونگھٹ کھول بدن حسیں لکھ دیکھن دے موہے
ناتر نعرہ ماروں جو سب جگ دیکھے توہے

اور یہ دوہے بھی قلندر صاحب سے ہی منسوب ہیں :

پنڈت ریکھا باچ کر پوتھی بانی پور
سگرے اچھر میٹ کر من میں سائیں لوڑ
پھوتی بھی تھوتھی پنڈت بھیا نہ کوئے
اِکو اچھر پریم کا بڑھے سو پنڈت ہوئے

ان کے معاصر حضرت امیر خسرو کی طرح قلندر صاحب کے متعلق بھی یہ بات دریافت نہ کی جا سکی کہ انھوں نے فنِ شعر میں کس بزرگ سے کسبِ فیض کیا اور کس کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ قصرِ عارفاں میں مولوی احمد علی صاحب نے آپ کے چار اساتذہ کا ذکر صرف نام لکھنے کی حد تک محدود رکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ حضرت بو علی قلندر نے مولانا سراج الدین مکّی، مولانا نجم الدین دمشقی، مولانا سیّد معین الدین عمرانی اور مولانا رکن الدین سامانی سے علومِ ظاہری کی تحصیل کی۔ ان بزرگوں

سے متعلق تقریباً سبھی تذکرے خاموش ہیں۔ بس ایک سید معین الدین عمرانی کا ذکر اخبار الاخیار، نزہتہ الخواطر اور مآثر الکرام وغیرہ تذکروں میں آیا ہے، لیکن بڑے ہی اختصار کے ساتھ۔ "مفتاح الغیب" میں لکھا ہے کہ حضرت قلندر صاحب نے مولانا سراج الدین مکی سے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ مولانا سراج الدین مکی کا مزار پانی پت ہی میں ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ قلندر صاحب نے ابتدائی تعلیم بھی انہیں سے حاصل کی ہوگی۔ اس کے برعکس مؤلفین "مفتاح الغیب" کا بیان ہے کہ قلندر صاحب کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ ہمارے نزدیک یہ بات خلافِ واقعہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک طرف تو مولانا سراج الدین مکی کے پانی پتی ہونے کی شہادت ملتی ہے، جن سے اوائل عمر میں آپ نے قرآن پاک حفظ کیا، تو دوسری طرف آپ کا ابتدائی ایام میں پانی پت سے زیادہ عرصے کے لئے دہلی جانا ثابت نہیں ہوتا۔ قلندر صاحب کی کتاب "حکم نامہ" میں اُن کا بعمر چالیس سال دہلی جانا تو مرقوم ہے جس سے ہمارے قیاس کو مزید تقویت ملتی ہے۔ البتہ مولانا معین الدین عمرانی بقول مولانا عبدالحئی بریلوی دہلی کے اساتذہ میں سے تھے لیکن ان کا زمانۂ تدریس زوالِ خاندانِ خلجی سے سلطان محمد تغلق تک کا ہے۔ اس لئے قلندر صاحب کا ان سے بہت چھوٹی عمر میں تعلیم حاصل کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں ہو سکتا۔ اِن سے فقہ و اصول اور معانی و بیان کے علوم قلندر صاحب نے جوانی کی عمر میں حاصل کئے ہوں تو بات قابلِ یقین کہی جا سکتی ہے۔ چونکہ مولانا معین الدین عمرانی کے سالِ ولادت اور سالِ وفات سے بھی ہم واقف نہیں، اِس

لئے کسی نتیجے پر پہنچنا بیحد دشوار ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا عمرانی قلندر صاحب کے صرف معاصر احباب میں سے ہوں اور اُن میں استادی شاگردی کا کوئی تعلق نہ ہو۔

سلسلۂ درس و تدریس

حضرت بوعلی قلندر صاحب کے دہلی تشریف لانے اور وہاں درس و تدریس میں مشغول رہنے سے متعلق دو مختلف روائتیں ملتی ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ بیس برس تک دہلی میں قطب مینار کے پاس مسجد قوۃ الاسلام میں قلندر صاحب کے درس و تدریس کا فیض جاری رہا۔ اس کے علی الرغم قصرِ عارفاں کیمطابق آپ نے چالیس سال تک تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد پانچ سال تک دریائے جمنا کے قریب مجاہدہ و ریاضت کو اختیار کیا۔ اس عرصے میں بھی آپ نے تعلیم و تذکیر کو شعار بنائے رکھا۔

قلندر صاحب نے بعمر چالیس سال پانی پت سے رختِ سفر باندھا اور دہلی تشریف لے آئے۔ وہ خود "حکم نامہ" میں فرماتے ہیں کہ جب میں دہلی پہنچا، تو خواجہ قطب الدین اوشی کے روضۂ مبارک پر دوگانہ شکرادا کیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہوا۔ دہلی کے معروف درویشوں اور علمائے کرام نے جمع ہو کر اس درویش سے کہا کہ ہم سب سے بزرگ آپ ہیں۔ مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا ظہیرالدین بخاری، مولانا صدرالدین، مولانا فخرالدین ناقلہ، مولانا شریعت الدین ترکی، مولانا معین الدین دولت آبادی

مولانا نجم الدین سمرقندی، مولانا قطب الدین مکی، مولانا احمد بخاری اور دوسرے علمائے بالاتفاق فتویٰ دینے کا شرف بخشا، اور بیس برس تک انہوں نے مفتی کا کام انجام دیا۔

"مفتاح الغیب" میں لکھا ہے کہ:

"آپ نے اپنی عمرِ عزیز کا بہت سا حصہ درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں گزارا۔ پرانی دہلی میں آپ کا قیام تھا۔ وہاں مدتوں آپ درس دیتے رہے۔ زمانۂ حاضرہ کے بڑے بڑے عالم، فقیہہ اور محدث آپ سے استفادہ کرتے تھے اور مدرسۂ یک مینار دہلی میں آپ مدرسِ اعلیٰ بھی تھے۔ علمائے وقت آپ کی علمیت کے اس قدر گرویدہ تھے کہ جب آپ دہلی سے عازمِ پانی پت ہوئے تو وقت کے نامور فضلاء کی ایک جماعت نے خواہش ظاہر کی کہ آپ چندے اور قیام فرماویں تاکہ ہم آپ سے نکاتِ توحید کے چند رسائل پڑھ لیں۔"

اس واقعہ کی تصدیق قلندر صاحب کے اس جملے سے بھی ہوتی ہے:

"جمیع دانشمندان برین درویش گفتند کہ یک ماہ دیگر بمانید تا از ہر کتاب و رسالہ سبق بگیریم۔"

لیکن آپ نے فتویٰ نگاری اور درس و تدریس کا سلسلہ یک لخت ترک کر دیا اور زہد و تقویٰ اور مجاہدہ و ریاضت کو شعار بنایا۔

آپ نے فتویٰ نگاری کا کام مسلسل بیس برس تک انجام دیا۔

عقیدت و ارادت

تمام تذکرہ نویسوں کے لئے آج تک یہ بات موضوعِ جستجو بنی رہی ہے کہ حضرت بوعلی قلندر نے اپنا رشتۂ عقیدت و ارادت کس بزرگ کے ساتھ منسلک کیا تھا اور اُنھوں نے کس مرشد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی؟ اس سلسلے میں بہت سی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً تاریخِ نظامی کے مصنّف لکھتے ہیں:-

"اکثر معتبر روائتیں یہی ہیں کہ آپ دراصل حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ کے مرید تھے۔ یہی روایات مصدّقہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ حضرت قطب صاحب کا وصال ۶۳۴ھ میں ہُوا اور قلندر صاحب کا وصال ۷۲۴ھ میں ہُوا۔ دونوں کا فرق نوّے سال برآمد ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قلندر صاحب ان دنوں جب کہ حضرت قطب الدین موجود تھے، پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے اور اگر پیدا ہو گئے ہوں گے، تو اتنے کم سن ہوں گے کہ ارادت و خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا شعور پیدا نہ ہُوا ہو گا۔"

اِس کے بعد گلشنِ اولیاء کے مؤلف کے حوالے سے حضرت قطب عالم پنڈوی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت شرف الدین پانی پتی نے کس کی بیعت کی تھی، تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ حضرت سلطان المشائخ کی اور

آن کی بیعت کے واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

"ایک مرتبہ حضرت قلندر صاحب کے دل میں خیال آیا کہ کسی ایسے بزرگ کا مرید ہونا چاہیئے کہ جس کو آسمانوں پر بھی تصرّف حاصل ہو۔ چنانچہ ایک روز اِس ارادہ سے آسمانِ اوّل پر عروج کیا اور حضرت سلطان المشائخ کو نماز پڑھتا ہُوا دیکھا۔ دوسرے روز دوسرے آسمان پر اور تیسرے روز تیسرے آسمان پر عروج کیا اور بدستور حضرت سلطان المشائخ کو نماز میں مصروف دیکھا۔ الغرض اسی طرح چھ آسمانوں کو مسلسل روزانہ دیکھتے رہے، اور حضرت کو بھی برابر نماز میں مصروف پاتے رہے۔ آخر جب ساتویں آسمان پر عروج کر چکے تو پھر ایک روز سب آسمانوں سے اوپر عالمِ بالا میں پہنچے، ستّر ہزار حجابات پیش آئے ان میں سے پچاس ہزار تاریک حجابات طے کر لئے اور ہر حجاب میں حضرت سلطان المشائخ کو بدستور نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ باقی بیس ہزار حجاباتِ نُورانی طے کرنا چاہتے تھے کہ ندائے غیب آئی" اے بو علی قلندر! یہاں سے آگے نہ جاؤ۔ یہ حجابات بغیر رہبریِ پیر کے طے نہیں ہو سکتے"۔ دوسرے دن حضرت سلطان المشائخ سے درخواست کی کہ مجھ کو بیعت کر لیا جائے۔ حضرت نے فرمایا، تم خود ہی ہفت افلاک کی سیر کر آئے ہو، اب تم کو میری کیا ضرورت ہے۔ قلندر صاحب نہ مانے اور اپنے بھائی کے ذریعہ کئی مرتبہ حضرت کی خدمت

میں عرض کرایا۔ آخر حضرت نے بہت اصرار کے بعد قلندر صاحب کو دریائے جمن کے
کنارے عصر کے وقت بیعت کرلیا اور بیعت کے بعد اپنی ٹوپی قلندر صاحب کو اوڑھا دی۔"

پہلے اقتباس میں پیر ضامن نظامی صاحب کا استدلال یہ ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت بوعلی قلندر کے وصال کی تاریخوں میں نوّے سال کا فرق ہے اس لئے قطب صاحب کی زندگی میں بوعلی قلندر ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے اور اگر پیدا ہو چکے تھے تو وہ ابھی بالکل کم سن ہوں گے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ قیاس محلّ نظر بھی ہے، اور خلافِ واقعہ بھی کیونکہ صرف وفات کی تاریخ ہی کسی کے طولِ عمر کا تعیّن نہیں کرتی بلکہ ولادت کی تاریخ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور ایسے مسئلوں میں تو ولادت کی تاریخ کو اور زیادہ اہمیّت حاصل ہوتی ہے جہاں صرف یہ معلوم کرنا مقصود ہو کہ بلحاظ عمر کون کتنا چھوٹا ہے اور کون بڑا ؛ علاوہ ازیں موت کا تعلّق بھی تو کسی خاص عمر یا سن وسال سے نہیں ہوتا بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مشیت سے ہوتا ہے۔

حضرت بوعلی قلندر کی تاریخِ ولادت اور وفات کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں اور کسی محقق یا مستشرق کو اختلاف نہیں۔ بہت سے تذکرے اس سلسلے میں راہنما ہو سکتے تھے، جن میں قلندر صاحب کی تاریخِ وفات کے ساتھ تاریخ ولادت بھی مل جاتی۔ بہرحال قلندر صاحب کی پیدائش کے باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اُن کی ولادت ۶۰۲ ہجری میں ہوئی تھی اور وفات کا سال ۷۲۴ ہجری ہے۔ گویا انہوں نے ایک سو بتیس تینتیس سال کے لگ بھگ عمر پائی۔ حضرت قطب الدین کی وفات ہے، جیسا کہ خود نظامی صاحب نے بھی لکھا ہے، ۶۳۴ ہجری

میں ہوئی۔ اس اعتبار سے ثابت ہُوا کہ حضرت قطب الدین کی رحلت کے وقت قلندر صاحب کی عمر تینتیس تینتیس سال ضرور تھی۔ اب یہ استدلال کہ قلندر صاحب کمسن ہوں گے اور ارادت و خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا شعور ان میں پیدا نہ ہُوا ہوگا، از خود ردّ ہو جاتا ہے کیونکہ اس عمر کے انسان کا ذہن پختہ ہو چکا ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا ہو۔ البتہ اس بحث سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ قلندر صاحب نے حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت ہرگز نہ کی تھی۔ ممکن ہے کہ قلندر صاحب نے حضرت خواجہ کی مریدی ہی اختیار کی ہو لیکن اس کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہو گی۔

بعض کتب میں ایک عجیب سا واقعہ بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ قلندر صاحب کا روحانی مرتبہ خواجہ محبوب الٰہی سے کہیں بلند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قلندر صاحب نے خواجہ صاحب سے ناراض ہو کر ولایت اور کرامت سلب کر لی تھی اور حضرت امیر خسرو نے مبارز خاں سے سفارش کرا کے ولایت اور کرامت دلائی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کہانی کا کسی صداقت اور حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اولیائے کرام کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ بھی آپس میں بغض و عناد اور ناراضگی وغیرہ رکھتے تھے، سراسر ایک بہتان ہے اور خود ایک گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ آٹھوں پہر اللہ جل شانہٗ اور اس کے حبیب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یاد میں غرق رہنے والے صوفیائے کبار اس قسم کی تمام سفلہ باتوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اُن کی ناراضگی کا یہ ڈھنگ ہرگز نہیں ہوتا، جو عام دنیا دار افراد میں پایا جاتا ہے۔ وہ خُلقِ عظیم کے پیرو ہوتے ہیں اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کرنے والے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے

بلا تامّل کچھ دوسرے ہمعصر بزرگوں کے درمیان بھی باہمی نارانگیوں کا ذکر کر دیا ہے۔

دوسری روایت قلندر صاحب کی بیعت کے بارے میں یہ ملتی ہے کہ اُنہوں نے امیر المؤمنین حضرت علیؓ سے روحانی طور پر بیعت کا شرف حاصل کیا تھا اور اُن کے لعابِ دہن سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ حضرت امیر المؤمنینؓ نے قلندر صاحب کو بعض غیبی اسرار و رموز بتلائے، رشد و ہدایت کی تلقین کی اور "بوعلی" کی کنیت سے بھی سرفراز فرمایا۔

"شرف المناقب" میں لکھا ہے کہ اگرچہ آپ کو اپنے زمانے کے بہت سے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہُوا مگر آپ کی تربیت بلاواسطہ جناب امیر المؤمنین علیؓ ابنِ ابی طالب کی روحِ مقدس سے ہوئی۔ شیخ محمد بن احمد نے اپنے بیان کے حق میں حسبِ ذیل تین دلائل پیش کئے ہیں:

۱۔ کوئی کتاب یا رسالہ ایسا نظر سے نہیں گزرا، جس میں آپ کی بیعت کے بارے میں واضح شہادت موجود ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں حاضر ہُوا کرتے تھے۔

۲۔ دوسری دلیل وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیان کو بتاتے ہیں کہ قلندر صاحب کی ارادت ان مشائخ میں سے کسی ایک ساتھ بھی مشہور نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ارادت رکھتے تھے، تو بعض کا خیال ہے کہ اُنہیں شیخ نظام الدین اولیاء سے عقیدت تھی اور ان میں سے کسی کی بات بھی صحت کو نہیں پہنچتی۔

۳۔ شیخ کالا، جن کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ قلندر صاحب کے بھتیجے تھے، وہ

فرماتے ہیں کہ حضرت قلندر کے خاص مرید شیخ عثمان اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک دن کسی نے مولانا سراج الدین مکی سے دریافت کیا گیا کہ قلندر صاحب کس کے مرید تھے، تو انھوں نے جواب میں بتایا کہ قلندر صاحب امیرالمؤمنین حضرت علیؓ کے مرید تھے۔ اُس آدمی نے کہا کہ ہم نے تو سنا ہے کہ وہ شاہ شہاب الدین کے مریدوں میں سے تھے۔ مولانا نے فرمایا، بے شک عوام کو صرف اُسی بیعت کا علم ہوتا ہے، جو ظاہر میں ہوتی ہے، لیکن اصل ارادت وہ ہے جو روحانی طور پر ہوتی ہے اور جس سے کسی کی روحانی تربیت کا سامان حاصل ہوتا ہے۔ ایسی بیعت اور عقیدت کا علم ہر آدمی کو نہیں ہوتا اور نہ خواص سے یہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد مولانا سراج الدین مکی نے فرمایا کہ میں نے قلندر صاحب کی زبانی بار ہا سنا کہ مجھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فیضِ روحانی حاصل ہوا ہے چنانچہ جس طرح سورج کی کرنیں جب دیوار پر پڑتی ہیں تو وہ منور ہو جاتی ہے، اِسی طرح حضرت امیرالمؤمنین کے روحانی نور سے میں نے روشنی حاصل کی ہے۔

مولانا سراج الدین مکی کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت بوعلی نے ظاہری بیعت شاہ شہاب الدین کے ہاتھ پر کی تھی اور روحانی بیعت حضرت علی ابنِ ابی طالب سے حاصل کی تھی۔ حضرت امیرالمؤمنین سے محبت و عقیدت کا واضح ثبوت قلندر صاحب کے کلام سے بھی ملتا ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ اے بوعلی! ہم لاشئے ہیں۔ ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے آقا حضرت علیؓ ہیں۔ وہی سب کچھ ہیں۔ وہی ہم غلاموں کے آقا و مولا ہیں۔

شعر حسبِ ذیل ہے:

بوعلی لا ماتیم و مولا علیؓ
بوعلی باشد علیؓ مولای ما

کشفی اور روحانی طور پر کسبِ فیض کا سلسلہ مسلمات میں سے ہے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضرت بوعلی کو امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے نورِ معرفت سے وافر حصّہ ملا تھا۔

اس سلسلے کی تیسری مشہور روایت یہ ہے کہ جن دنوں قلندر صاحب مسجد قوۃ الاسلام دہلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے، اُنہی دنوں ایک درویش مسجد کے پاس سے گزرا۔ آپ اُس وقت وعظ و نصیحت میں معروف تھے۔ اس درویش نے مسجد کے دروازے پر آکر بآوازِ بلند کہا :

"شرف الدین! تو جس مقصد کے لئے پیدا ہُوا تھا، کیا اُسے بھول گیا ہے؟ تو کب تک قیل و قال میں لگا رہے گا؟"

اس درویش کی اِس بات سے حضرت بوعلی کے دل میں عشقِ الٰہی کی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ اشارہ پاکر شیخ شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس اعتبار سے آپ کا شجرۂ طریقت حسبِ ذیل ہے، جو تیسرے واسطے سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملتا ہے :

حضرت بوعلی قلندر، مرید حضرت شیخ شہاب الدین مرید حضرت شیخ امام الدین ابدالی مرید حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی مرید حضرت خواجہ معین الدین چشتی مرید حضرت

خواجہ عثمان ہرونی مرید حضرت خواجہ حاجی شریف زندانی مرید حضرت خواجہ مودود چشتی مرید حضرت خواجہ ابی یوسف چشتی مرید حضرت خواجہ ابی محمد بن ابن احمد چشتی مرید حضرت خواجہ ابی احمد ابن فرسنافہ چشتی مرید خواجہ ابی اسحاق شامی مرید حضرت خواجہ ممشاد علی دینوری مرید حضرت خواجہ امین الدین ابی ہبیرۃ البصری مرید حضرت خواجہ سدید الدین حذیفۃ المرعشی مرید حضرت خواجہ ابراہیم ادہم بلخی مرید حضرت خواجہ ابی الفیض فضیل ابن عیاض مرید حضرت خواجہ ابی الفضل عبدالواحد ابن زید مرید خواجہ حسن بصری مرید امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ۔

"مفتاح الغیب" کے مؤلفین لکھتے ہیں:

"یہ نسبت خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ شیخ شہاب الدین عاشقِ خدا خود قلندر صاحب کے مجاہدات و ریاضات اور باطنی تصرفات کے گرویدہ تھے اور حسبِ ارشاد خواجہ قطب الدین صاحب بختیار کاکی اکثر اوقات آپ قلندر صاحب کی محفل میں حاضر ہوتے تھے اور فیض یاب ہو کر جاتے تھے۔"

اس کے برعکس "سیر الاقطاب" نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔

چوتھی روایت یہ ہے کہ قلندر صاحب نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے اپنا رشتۂ عقیدت استوار کیا تھا۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ قطب الدین کے ملفوظات کے ضمن میں جب مختلف مجالس کا ذکر فرماتے ہیں، تو حاضرین مجلس میں

شیخ شرف الدین کا نام بھی تحریر کرتے ہیں ۔ قیاس غالب یہی ہے کہ یہ شیخ شرف الدین حضرت بوعلی قلندر ہی تھے ۔ صاحبِ "شرف المناقب" نے بھی لکھا ہے کہ قلندر صاحب کبھی کبھی خواجہ قطب الدین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے ۔ خواجہ صاحب بھی اُن پر خاص توجہ اور مہربانی فرماتے تھے ۔ قلندر صاحب خواجہ صاحب کی "انجمنِ شوق اور مجلسِ صحبت" میں بھی حاضر ہوتے تھے ۔

سید محمد میاں صاحب کو اس بات سے اختلاف ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"حضرت قلندر صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت نہیں تھے کیونکہ حکمنامہ کی تصریح کے بموجب حضرت قلندر صاحب چالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے ہیں ۔ یعنی ۶۴۴ھ میں اور حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے گیارہ سال پہلے ۶۳۳ھ میں وفات پاچکے ہیں ۔ لہٰذا بلاواسطہ حضرت قطب صاحب سے بیعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔"

یہ درست ہے کہ حضرت بوعلی چالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے ، لیکن آپ کی یہ آمد دہلی میں مستقل سکونت کے سلسلے میں تھی ۔ اس سے اگر کوئی یہ اندازہ لگائے کہ وہ بقول سید محمد میاں صاحب ۶۴۴ھ سے پہلے کبھی دہلی آئے ہی نہیں ، تو خلافِ قیاس بات ہوگی ۔ ترک و اختیارِ سکونت کے لئے یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ یا تو تارک کو اپنے وطن میں کسی مشکل کا سامنا ہوتا ہے ، جس کا حل اُسے صرف ترکِ وطن کی صورت

ہی ہیں نظر آتا ہے یا پھر اُسے اس مقام سے جہاں وہ سکونت اختیار کرنا چاہتا ہے، کوئی خاص لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے جس کی کشش کے سامنے وطن کی محبت ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے، یعنی دونوں حالتیں کسی مجبوری پر دلالت کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مؤخرالذکر حالت میں تعلقِ خاطر اور دلی لگاؤ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس کے باعث ہی کوئی ترکِ وطن کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ کیا یہ تعلق اور لگاؤ یک لخت پیدا ہو جاتا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے بلکہ اس مرحلے تک پہنچتے کچھ وقت لگتا ہے اور اس کے کچھ عوامل اور محرکات بھی ہوتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ تارک جس مقام کی طرف جانا چاہتا ہے، خود اُس مقام میں کچھ ذاتی دلکشی موجود ہے، مثلاً وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے یا وہاں زندگی کی دوسری سہولتیں نسبتہً بہتر اور بآسانی فراہم ہو سکتی ہیں وغیرہ۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں کوئی فرد یا افراد ایسے بستے ہوں، جن کی کشش ترکِ وطن کیلئے مجبور کر رہی ہو۔ پہلی صورت میں یہ بات عیاں ہے کہ تارک نے وہ مقام ایک مرتبہ نہیں بار بار دیکھا ہوگا۔

اب اگر تارک اپنے وطن کو مقامی مشکلات اور ناخوشگواریوں کی وجہ سے چھوڑنا چاہتا ہے، تو بھی یہ بات ضروری ہے کہ جس مقام کو وہ اپنا نیا وطن بنانا چاہتا ہے، وہ اس کا دیکھا بھالا ہو۔ وہاں کچھ اُس کے جاننے والے ہوں ورنہ ترکِ وطن کا مقصد حل نہ ہوگا۔ حضرت بو علی قلندرؒ نے چالیس برس کی عمر میں پانی پت کو چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بظاہر ہمیں کوئی ایسی مجبوری نظر نہیں آتی کہ جس کی بدولت آپ نے اپنا

وطن چھوڑا۔ بفرضِ محال کوئی مجبوری درپیش تھی بھی تو یہ بات خلافِ قرائن ہے کہ آپ نے یکدم دہلی میں جاکر رہائش اختیار کر لی تھی اور اس سے پہلے کبھی دہلی کا منہ نہ دیکھا تھا۔ آپ کے دہلی جابسنے کی وجہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آپ نے ترکِ وطن سے پہلے متعدد مرتبہ دہلی کا سفر اختیار کیا ہوگا اور جب یہ بات مان لی جائے، تو ۶۳۲ھ سے پہلے حضرت قطب الدین بختیار کاکی جیسی بزرگ ہستی سے ملے بغیر ان کا دہلی سے ہو کر واپس چلے آنا بھی خلافِ واقعہ بات ہوگی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر حضرت خواجہ قطب الدین کے ساتھ قلندر صاحب کی براہِ راست عقیدت و ارادت نسبتہً زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تبلیغ وہدایت

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی اشاعت کا کام سراسر اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی مساعی کا مرہونِ منت ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریا سہروردیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت خواجہ صابر کلیریؒ، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الفِ ثانیؒ، حضرت میاں میر صاحبؒ اور ایسے ہی عالی مرتبت دوسرے بزرگوں میں حضرت بوعلی قلندر بھی شامل ہیں۔ آپ نے مدت العمر تعلیم و تدریس اور اصلاح و ارشاد کا فریضہ سرانجام دیا اور بے شمار افراد کو اپنے نورِ علم سے مستفیض فرمایا۔

جیسا کہ درس و تدریس کے سلسلے میں ان باتوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ دہلی کے بڑے بڑے اور نامور علماء نے آپ کی فضیلت کا اقرار کیا تھا۔ اب یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ آپ کے ذریعے سے نہ صرف اسلامی علوم ہی کو فروغ ہوا بلکہ آپ کے طفیل سے بہت سے افراد نے دینِ حق کو قبول کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ سر تھامس آرنلڈ نے پانی پت کے بہت سے ہندو راجپوتوں کا آپ کے ذریعے سے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے، جن میں سے صرف مردوں کی تعداد ہی تین سو تھی۔ یہ نومسلم راجپوت امر سنگھ کی اولاد میں سے تھے۔ امر سنگھ کے آباؤ اجداد پانی کے راجے تھے اور پانی پت کے قرب و جوار میں بہت سے علاقے ان کے قبضے میں تھے۔ خلجیوں کے ساتھ لڑائی میں یہ خاندان تباہ ہو گیا اس خاندان کے سبھی افراد خلجیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ صرف ایک حاملہ عورت بچی، جو چھپتے چھپاتے جوالہ پور ضلع سہارنپور میں اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ جوالہ پور میں اس کے بطن سے امر سنگھ کی ولادت ہوئی۔ امر سنگھ جوان ہوا تو اپنی کھوئی ہوئی جاگیریں واپس حاصل کرنے کے لئے اس نے پانی پت کا قصد کیا۔ "مفتاح الغیب" میں لکھا ہے:

"جب (امر سنگھ) دریائے جمنا کے کنارے پہنچا، تو ایک درویش محوِ عبادت نظر آئے۔ وہ درویش قبلہ بوعلی قلندر تھے۔ امر سنگھ کی سج دھج دیکھ کر قلندر صاحب نے فرمایا کہ بیٹا تجھ سے اسلام کی بو آتی ہے۔ جس ارادہ پر تم گھر سے نکلے ہو، وہ خیالِ خام ہے۔ تمہارے لئے اسلام کی حلقہ

بگوشی ہی باعثِ عزت ہے۔ امر سنگھ نے عرض کی کہ میں نے اپنی والدہ سے مشورہ نہیں لیا، اگر اجازت ہو تو پوچھ آؤں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ اُس نے واپس آکر اپنی ماں سے پوچھا۔ راوی (جس کا نام نہیں لکھا) کا بیان ہے کہ جب وہ مشورہ کر رہے تھے، تو قلندر صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ اُس کی والدہ سے کہنے لگے کہ تم اسے اسلام قبول کرنے کی اجازت دے دو۔ اُس نے سوال اٹھایا کہ مجھے اس میں کوئی عذر نہیں۔ میرا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ اسے اگر اجازت دے دوں، تو اس کا ناطہ (ناتا) رشتہ کہاں ہوگا۔ آپؒ نے فرمایا، غم نہ کرو۔ اس کے لواحقین بھی دائرۂ اسلام میں آجائیں گے۔

بآلاخر والدہ نے اجازت دے دی مگر قلندر صاحب اس وقت غائب ہو گئے۔ جب امر سنگھ اجازت لے کر جمنا کے کنارے پر آیا، تو آپ وہیں ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔ قلندر صاحب نے پاس بلا کر اسلام سے مالا مال کر کے امر اللہ خاں نام رکھا۔"

آگے چل کر "مفتاح الغیب" کے مؤلفین لکھتے ہیں کہ قلندر صاحب کی سفارش سے خلجیوں نے امر اللہ خاں کی تمام جاگیریں اور املاک بھی واگزار کر دیں اور وہ پھر سے آبائی منصب پر مأمور ہو گئے۔ اس کے علاوہ قلندر صاحب کے تصرّفِ باطنی سے امر اللہ خاں کے ننھیال کے سبھی افراد مسلمان ہو گئے اور اُس کی شادی اِسی خاندان میں ہوئی۔ امر اللہ خاں

کے ہاں تین بیٹے ہوئے، یعنی شہاب خاں، شہباز خاں اور دولت خاں۔ اِن تینوں کی اولاد اب تک پانی پت میں موجود ہے۔

محویت اور جذب و مستی

"سِرِّ دلبراں" کے فاضل مصنّف لکھتے ہیں کہ "جس طرح بچوں کو ابتدا میں عموماً میٹھی چیز سے رغبت ہوتی ہے اِسی طرح مبتدیوں کو ابتدا میں ذوق و شوق کا فیضان کیا جاتا ہے تاکہ ان کا جی لگے اور وہ ترقی کریں۔ جب بچے عمر میں کسی قدر ترقی کرتے ہیں، تو انہیں طبعی طور پر کھٹی چیز سے رغبت ہوتی ہے۔ تُرشی کی اس رغبت کے قائم مقام باطن میں وہ مسرّت اور خوشی ہے، جو مبتدی کو ذرا آگے چل کر حاصل ہوتی ہے۔

اس مسرّت اور خوشی کا لطف تلخی کے باطنی قائم مقام یعنی غیر مفید اشیاء اور صحبتِ ناجنس سے گریز و نفرت کو جو کہ پہلے سے طالب میں موجود ہوتی ہے، مشتعل کر دیتا ہے۔ جب عمر میں ذرا اور ترقی ہوتی ہے، تو نمک سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ گو تُرشی اور شیرینی سے بھی رغبت رہتی ہے مگر سیری نمکین غذا ہی سے ہوتی ہے۔ اسی طرح جب سالک ترقی کرتا ہے، تو اس پر دلائل و براہین کی بارش ہوتی ہے اور کشفِ حقائق کی امواج میں وہ تیرتا پھرتا ہے۔ بڑی عمر میں جا کر تُرشی اور شیرینی کی رغبت میں بہت کمی واقع ہو جاتی ہے اور اس وقت جو سیری گیہوں کی روٹی کے سوندھے پن سے حاصل ہوتی ہے، وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح

منتہی کا مقام محویت ہے، جہاں پہنچ کر کشف وکرامات وغیرہ سب بند ہو جاتے ہیں۔ اور لذتِ حضوری سے سیری ہی نہیں ہوتی" ــــــــ اور "حیرت و ولولہ جو سالک صاحبِ شہود کو جمالِ دوست میں پیدا ہو، اُسے مستی کہتے ہیں"۔

"مفتاح الغیب" کے مؤلفین کا بیان ہے کہ "منزلِ عشق میں جذب ومستی اور بیخودی ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر عشق کے دشوار گزار مقامات سے عبور متعذر رہے۔ عارف لوگوں کے کلام میں جام و شراب کی طلب اور اس کے چرچوں سے یہی مستی مراد ہوتی ہے، جو مسافر کے لئے خضرِ راہ کا کام دیتی ہے، جس کے بغیر سالک منزلِ مقصود تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ــــــــ قلندریہ سلسلہ کے سالکین جذب ومحویت میں اس درجہ بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور اُن کی بیخودی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنی نادر محویت کی وجہ سے جذباتِ حق کی لوریوں اور وجدانِ حقیقی کی روح پرور تمناؤں میں ہمیشہ محو در محو رہتے ہیں۔ بعض سالکوں کا مقام استغراق سے بھی بالاتر ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عبدالعزیز مکی قلندر کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کا ہر استغراق چالیس سال کا ہوتا تھا"۔

حضرت بوعلی پر جذب ومستی کے وارد ہونے سے متعلق "محفل الاصفیاء" نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قلندر صاحب کے ایک مرید کے ہاں اولاد نہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ قلندر صاحب دعا فرمائیں، تو اللہ انہیں بھی اولاد کی نعمت عطا کر دے۔ چنانچہ اس مرید نے قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ حضور آپ میرے غریب

خانے پر تشریف لے چلیں۔ میری بیوی کی آرزو ہے کہ وہ آپ کے ہاتھ دھلائے اور آپ کو کھانا پیش کرے اور پھر آپ کی خدمت میں اولاد کے لئے دعا کی درخواست کرے۔ قلندر صاحب نے اس مرید کی درخواست قبول کر لی اور وہ اس کے ہمراہ اس کے گھر تشریف لے گئے۔ اس شخص کی بیوی بیحد خوبصورت تھی۔ قلندر صاحب آئے، تو اس عورت نے قیمتی زیور اور عمدہ رنگین لباس زیبِ تن کیا اور ہاتھ میں طشت اور آفتابہ لے کر قلندر صاحب کے ہاتھ دُھلانے کے لئے سامنے آئی۔ قلندر صاحب کی نظر اس پری چہرہ پر پڑی، تو دفعۃً حیرت میں رہ گئے اور دم بخود ہو کر دیر تک اُس کی طرف تکتے رہے۔ اس پری چہرہ کے دیکھنے سے بو علی قلندر پر جذب و مستی کی حالت طاری ہو گئی۔ اس دگرگوں حالت میں اُن کے منہ سے یہ شعر نکلا:

گر عیبِ من ببینست کہ عشقت گزیدہ ام
بخ بخ وان یزید عیوبا علی العیوب

ہمارے نزدیک اس واقعہ کی صداقت محلِ نظر ہے اور اسے قلندر صاحب کی محویت اور جذب و مستی سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ قلندر صاحب سے منسوب کتاب حکم نامہ میں لکھا ہے کہ جذب و مستی کے عالم میں حضرت بو علی قلندر نے مسافرت اختیار کی۔ سفر کے دوران میں اُن کی ملاقات حضرت شمس الدین تبریزی اور حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی سے بھی ہوئی۔ کچھ عرصہ ان بزرگوں کی خدمت میں رہ کر قلندر صاحب نے وطن کے لئے رختِ سفر باندھا۔ واپسی پر حضرت شمس تبریزی اور

مولانا رومی نے آپ کو جبہ و دستار سے سرفراز کیا۔ ہندوستان واپس آکر شیخیت کی دکان دریائے جمنا میں بہادی اور قلندرانہ وضع قطع کو اپنا شعار بنایا۔

یہ روایت سراسر وضعی معلوم ہوتی ہے اور حضرت بوعلی قلندر کی جذب و مستی کی زندگی سے متعلق آنے والی ان روایات میں سے ہے، جن میں اکثر و بیشتر بے سروپا افسانے شامل کر دیئے گئے ہیں۔ بہرصورت یہ بات کہ آپ کی زندگی میں جذب و مستی کی ابتداء کب اور کیونکر شروع ہوئی، روزِ اوّل کی طرح اب بھی فیصلہ طلب ہے۔ البتہ یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ حضرت بوعلی قلندر ایک مستِ الست فنا فی اللہ بزرگ تھے۔ آپ نے مدّت العمر کڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ ممکن ہے کہ ان ریاضتوں اور عبادتوں کی کثرت کے باعث ہی آپ پر محویّت و استغراق اور جذب و مستی نے غلبہ کیا ہو، مختلف تذکروں نے آپ کے استغراق کا ایک یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ پر محویت نے اس قدر طویل غلبہ کیا کہ آپ کی لبیں بہت زیادہ بڑھ گئیں اور آپ کو کچھ ہوش نہ تھا۔ عقیدت مندوں میں اتنی جراءت نہ تھی کہ آپ کو متوجہ کرتے یا کسی طرح آپ کی لبیں تراشنے کا سامان کرتے۔ لوگوں نے مولانا ضیاء الدین سنامی علی مفتی کو اطلاع دی۔ وہ آئے اور قلندر صاحب کی ریش مبارک پکڑ کر لبیں تراش دیں۔ کہتے ہیں کہ جب مولانا ضیاء الدین چلے گئے، تو حضرت بوعلی قلندر نے اپنی ریش پکڑ کر فرمایا کہ یہ ریش کتنی مبارک ہے، جو محمدی شریعت کی راہ میں پکڑی گئی۔

شیخ محمد بن احمد نے "شرف المناقب" میں مولانا ضیاء الدین علی مفتی اور قلندر صاحب

کے مابین ایک مکالمہ بھی درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب نے قلندر صاحب کو نماز پڑھنے کی تاکید کی تو قلندر صاحب نے جواب دیا:

مجھے نماز بارگاہِ الٰہی سے معاف ہو چکی ہے۔

مفتی صاحب: پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو نماز معاف نہیں ہوئی، تمہیں کس طرح معاف ہو گی؟

قلندر صاحب: میں خود اپنے اختیار میں نہیں ہوں مستِ اَلست ہوں اور دکھاوے کی نماز میں نہیں جانتا۔

مفتی صاحب: اس معاملے میں کوئی حیلہ کام نہیں آسکتا۔

قلندر صاحب مفتی صاحب کی اس بات پر جوش میں آگئے اور مفتی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اُٹھیئے اور کمر بند سے میری کمر کو کس کر باندھ دیجیئے۔ اگر میری کمر بندھی رہے تو شریعت کا حکم مجھ پر نافذ کر دیجیئے اور اگر بندی نہ رہے، تو مجھے شرعی احکام سے معاف سمجھیئے۔

مفتی صاحب اُٹھے انہوں نے قلندر صاحب کی کمر میں کمر بند کس کے باندھنا چاہا، لیکن کمر بند ان کے ہاتھ ہی میں رہ گیا اور قلندر صاحب کمر بند سے آزاد کھڑے رہے۔

اس پر مفتی صاحب شرمندہ ہوئے۔ پھر قلندر صاحب پہ شانِ جلالی کی بجائے شانِ جمالی طاری ہوئی اور انہوں نے مفتی صاحب سے کہا کہ میں عاشق ہوں اور اپنے عشق میں مبتلا ہوں۔ آپ فرض ادا کریں میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہوتا ہوں۔ چنانچہ

مفتی صاحب کی امامت میں نماز باجماعت ہوئی۔ قلندر صاحب مقتدی بنے۔ نماز میں قلندر صاحب پر استغراق کا عالم وارد ہوگیا۔ مفتی صاحب نماز سے فارغ ہوئے، تو قلندر صاحب کو سر جھکائے کھڑے پایا۔ مفتی صاحب نے پوچھا:

یا حضرت! آپ ابھی تک اس حالت میں کیوں کھڑے ہیں؟

قلندر صاحب نے سر اُٹھاتے ہوئے جواب میں یہ دوھا پڑھا:

انکن کھاتی گرتّد دھاوے
یہ نماز شرفاء نہیں بھاوے

حاضرین نے کہا کہ ہم آپ کے ارشاد کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ قلندر صاحب نے فرمایا:

جب تک حضورِ قلب نہ ہو، اس وقت تک نماز نہیں ہوتی۔ حاضرین نے بات کی مزید وضاحت چاہی تو قلندر صاحب نے فرمایا:

مفتی صاحب کی گھوڑی نے بچہ دیا ہے۔ ان کے مکان میں ایک کھاتی (یعنی وہ گڑھا جس میں گندم ذخیرہ کی جاتی ہے۔ اسے چاہِ گندم بھی کہتے ہیں) بھی ہے۔ مفتی صاحب جب نماز پڑھا رہے تھے، ان کا دھیان اپنے مکان کی طرف تھا اور دل میں خطرہ تھا کہ گھوڑی کا بچہ کہیں اس "کھاتی" میں نہ گر جائے۔ اور میں ایسا عاشقِ الٰہی ہوں، جو کبھی تو بڑے جوش و خروش کی حالت میں ہوتا ہے اور کبھی ایک غلام کی

مانند خاموش ہوتا ہے۔ میں عشق خدا کے سوا کچھ بھی نہیں جانتا۔

مفتی صاحب قلندر صاحب کی بات سن کر بے حد شرمندہ و نادم ہوئے۔ صاحب "شرف المناقب" نے آپ کے استغراق وجذب کا ایک اور واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت قلندر صاحب سیر کرتے کراتے اپنے والدین کی زیارت کے لئے پانی پت میں وارد ہوئے۔ پانی پت کے قیام کے دوران میں ایک دن ان پر استغراقی کیفیت طاری ہو گئی۔ پانی پت کے لوگوں پر آپ کی زندگی کا یہ رخ ظاہر نہ تھا، اس لئے وہ اکثر آپ سے پوچھتے تھے کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ حضرت بو علی قلندر انہیں کہتے کہ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ اس پر یہ لوگ برہم ہوئے اور انہوں نے مل ملا کر آپ کے خلاف ایک محضر نامہ تیار کیا۔ اس محضر نامے کا ترجمہ "مفتاح الغیب" کے مطابق حسب ذیل ہے:

"شرف الدین فاضل و عالم ہے۔ چالیس سال تک دہلی میں درس و تدریس، وعظ و نصیحت اور علمی مشاغل میں معروف رہا۔ اب اپنے وطن پانی پت آیا ہے اور علوم ظاہری کے دروازے بند کر کے عالموں اور فاضلوں کی صحبت سے متنفر ہو کر گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ متابع شریعت سے تہی دست ہے، لہٰذا سزا کے قابل ہے"۔

بقول میاں محمد صاحب اس محضر نامے پر اس زمانے کے قاضی اور مفتی حضرات کے علاوہ جملہ اکابر و مشاہیر کے دستخط اور مہریں ہو گئیں۔ آخر میں کسی وجہ سے یہ محضر نامہ

خواجہ نصیر الدین اور خواجہ مسعود کے سامنے آیا۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ان کے والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ ملک علی انصاری تھا، (ابنِ خواجہ ترک علی بن مسعود ثانی بن شیخ خواجہ عمر بن خواجہ ابراہیم بن شیخ عثمان بن ابو طاہر بن احنف بن انفع بن نافع بن محمود شاہ بن مسعود بن شیخ عبداللہ انصاری) یہ دونوں بھائی ابھی طالب علم تھے اور قصبہ بابل سے آکر پانی پت کی ایک مسجد میں مقیم تھے۔ انھوں نے محضر نامہ دیکھا، تو اس کو چاک کر ڈالا۔

اس کے برعکس "مفتاح الغیب" کا بیان ہے کہ یہ محضر نامہ مفتی ضیاء الدین نے قلندر صاحب کے خلاف لکھا تھا اور انھوں نے کچھ بزرگوں اور سرداروں سے شہادت لے کر محضر نامے کو بند کر کے خواجہ ملک علی انصاری کے پاس تصدیق کے لئے بھیج دیا۔ خواجہ علی انصاری ہرات کے علماء اور فضلاء کے سرخیل تھے اور اُس وقت ٹھٹھہ میں سکونت پذیر تھے۔ یہ بزرگ اسرار و رموزِ معرفت کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے، اس لئے جب محضر نامہ اُن کے پاس پہنچا، تو انھوں نے اُسے چاک چاک کر دیا۔ مفتی ضیاء الدین کو جب اِس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہیں بہت غصہ آیا۔

انھوں نے خواجہ علی انصاری کو عدالت میں بلا بھیجا۔ خواجہ علی انصاری مسلّح ہو کر عدالت میں آئے، مفتی صاحب نے محضر نامے کو پھاڑنے کی وجہ دریافت کی۔

خواجہ صاحب نے جواب میں کہا:

"یہ درویش بو علی قلندر مست الست اور مجذوب ہے۔ ایسے درویشوں پر شرعی احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ آیۂ کریمہ لَا تَقْرَبُوا

الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی۔ (النساء، ۴۳) (یعنی جب تک تم اپنے حواس میں نہ ہو، اُس وقت تک نماز کے قریب نہ جاؤ۔) کے مطابق شرعی پابندیوں سے معذور رہے اور تم لوگ اِس کی نظرِ فیض کو نہیں پہچان سکتے۔ ایسے درویش کو دکھ پہنچانا کسی مذہب میں جائز نہیں۔"

مفتی ضیاء الدین اور انصاری خاندان کا یہ معاملہ لوگوں کے کہنے سننے کے بعد فریقین کی صُلح پر ختم ہو گیا۔

"شرف المناقب" کے حوالے سے سیّد محمد میاں لکھتے ہیں کہ خواجہ ملک علی انصاری کے بیٹے خواجہ نصیر الدین اور خواجہ مسعود کہ جنہوں نے محضر نامے کے قصّے میں مفتی ضیاء الدین کی مخالفت کی تھی، ایک دن اپنی مسجد میں بیٹھے تھے کہ قلندر صاحب بھی وہاں چلے آئے۔ دونوں بھائیوں نے آپ کی قدم بوسی کی اور مسجد میں لا کر جو ماحضر تھا، وہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ قلندر صاحب نے ان کے لئے دُعا فرمائی اور یہ بشارت دی کہ تم پانی پت میں بڑی دلجمعی اور اطمینان سے رہو گے۔

قلندر صاحب کی دُعا سے ان دونوں بھائیوں کی اولاد آج تک پانی پت میں آباد ہے۔ یہ خاندان بڑی ترقی کر رہا ہے اور اِس میں شیخ امان اور شیخ حسین جیسے صاحبِ کشف و کرامت بزرگ ہوئے ہیں۔

مولانا سید محمد میاں نے انصاری خاندان کی حضرت بو علی قلندر سے عقیدت و ارادت کے سلسلے میں عبدالسلام چشتی کے ایک قلمی رسالے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"_______ اِس میں چند سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔
ساتویں سوال کے جواب کے آخر میں تحریر ہے۔ واضح ہو کہ ان جناب حضرت خواجہ شرف الدین میں خواجہ ملک علی انصاری بہت ذی علم اور ذی فضل (اولاد میں د ؟) خواجہ عبداللہ انصار کے مع پسران خواجہ نصیر و خواجہ مسعود) وارِدِ پانی پت ہوئے۔ پیشہ درس و تدریس گرم رکھتے تھے۔ ان کو ساتھ حضرت شرف الدین کے ایک طرح کی عقیدت ہو گئی تھی۔ حضرت نے فرمایا تم سکونت اِس دیار میں اختیار کرو اور عصا دستی اپنا عطا کیا، اور اولاد در نسل کی افزائی کی دعا دی۔ پس وہ بزرگ بطوع و رغبت سکونت پذیر پانی پت ہوئے۔ اولاد ان کی انصار ماشاء اللہ تا حال قائم و برقرار ہے۔"
یہ رسالہ ۱۲۸۰ھ کی تصنیف ہے اور اردو زبان میں ہے۔ اس رسالے کے مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت بو علی قلندر نے باقی تمام عمر عالمِ جذب و مستی میں گزاری

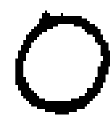
وفات

بوڈہ کھیڑہ کا جنگل کرنال شہر کے قریب کچھ ہی فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت بوعلی قلندر نے اپنی عمر کے آخری ایام میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی اس جنگل میں بنا لی تھی اور مستقل طور پر اس میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اس کٹیا میں آپ

نے بعمر ۱۲۰ سال رحلت فرمائی۔ یہ سانحہ ۷۲۴ھ میں پیش آیا۔ "یا شرف الدین ابدال" کے اعداد سے سالِ وفات نکلتا ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے حسبِ ذیل تین قطعوں سے سالِ وفات نکالا ہے:

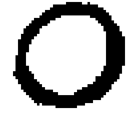
چون شرف از جہان بہ جنّت رفت
متّصل شد بہ وصلِ ربِّ ودود
سالِ وصلش "شرفِ ولیِ زمان" ۷۲۴ھ
نیز فرما "شرفِ ولیِ محمود" ۷۲۴ھ

باز دیگر "شرفِ سعید" بگو ۷۲۴ھ
سالِ ترحیلِ آن شہِ باجود
نیز شد سالِ رحلتش پیدا
"زیبِ عالم قلندرِ مسعود" ۷۲۴ھ



قلندر بو علی چون از جہان رفت
کہ او نامِ شرف با اہلِ دین بود
ز "مخدومِ اجل" سالش ہویدا ست ۷۲۴ھ
دگر ہم "معدنِ اسرارِ محمود" ۷۲۴ھ
"شرف محبوبِ مولیٰ" گفت سرور ۷۲۴ھ

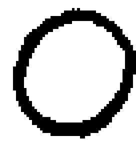
بسالِ رحلتِ آن معدنِ جود



منظہرِ نورِ پیمبر بو علی　　شیخِ عالم، شاہِ اکبر بو علی
گشت تاریخِ وصالِ او عیان　　"مالکِ عالی قلندر بو علی" ۷۲۴ھ
نیز سرور گفت سالِ رحلتش
"طالبِ محمود سرور بو علی" ۷۲۴ھ

عطاؔ و منظہر نے تاریخِ وفات اس قطعے سے نکالی ہے :

شرف دادہ شرف دینِ خدارا　　خدا بخشد چنین اہلِ صفا را
بہ عالم آمدہ از جملۂ عشق　　کہ از حکمت کشاید مسئلۂ عشق
ہمہ عمرش بہ طلبِ حق صرف شد　　بہ جملہ عاشقان او را شرف شد
چو مجنون در وصالش بیقرارے　　چو فرہاد عاشقِ سیمین عذارے
بروزِ سیزدہم ماہِ رمضان　　بحق پیوست شاہِ اہلِ عرفان
منقش روضہ اش کردہ مصور　　بجو سالش ز "توحیدِ منور" ۷۲۴ھ



مفتی غلام سرور صاحب نے خزینۃ الاصفیاء میں "سیر الاقطاب" اور "تذکرۃ العاشقین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت بو علی قلندر ۱۳ رمضان المبارک ۷۲۴ھ کو فوت ہوئے۔ مولوی عبدالحی بھی آپ کے ہمزبان ہیں۔ اس کے برعکس مولانا

سید محمد میاں لکھتے ہیں کہ قلندر صاحب نے ۹، رمضان المبارک کی رات کو رحلت فرمائی۔ "مفتاح الغیب" میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔ البتہ وفات کا وقت "بعد از مغرب" بتایا ہے۔ قیاسِ غالب یہی ہے کہ مؤخر الذکر حضرات نے تاریخِ وفات شیخ محمد بن احمد کی "شرف المناقب" سے لی ہے۔ ذوالفقار لودھی کو ان سب حضرات سے اختلاف ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں قلندر صاحب کی وفات کا دن ۱۶، رمضان المبارک ۷۲۴ھ لکھا ہے، لیکن کوئی سند پیش نہیں کی۔ مولانا سید محمد میاں صاحب کا بیان ہے کہ آپ کی تاریخِ وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی زیادہ چھان بین سے کام نہیں لیا ہے۔ چونکہ اس وقت کوئی قابلِ اعتماد تحریر ہماری دسترس میں نہیں ہے، اس لئے واضح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپ نے کس تاریخ کو وفات پائی۔ البتہ اگر "شرف المناقب" کی قدامت کو مدِ نظر رکھا جائے، تو ۹، رمضان ہی آپ کی وفات کا دن قرار پاتا ہے کیونکہ یہی کتاب قدیم ترین ماخذ قرار دی جا سکتی ہے۔

تدفین

صاحب "شرف المناقب" کا بیان ہے کہ وفات کے وقت حضرت بو علی قلندر کے پاس کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اس لئے کسی کو بھی آپ کے وصال کی خبر بروقت نہ ہو سکی۔ آپ کا جسدِ مبارک ایک رات اور ایک دن یونہی پڑا رہا۔ دوسرے دن

شام کے وقت کچھ لکڑہارے آپ کی زیارت کے لئے آئے تو انہیں آپ کے انتقال کا پتہ چلا۔ اُن لکڑہاروں نے فوراً شہر میں آکر لوگوں کو اطلاع دی۔ کرنال کے لوگ دوسرے دن یعنی ۱۱ رمضان المبارک کے دن بوڑھہ کھیڑہ پہنچے۔ آپ کی لاش "زیرازیوا" چبوترے پر قبلہ رو پڑی ہوئی تھی۔ اہلِ کرنال آپ کے جسدِ خاکی کو شہر اٹھا لائے اور غسل دینے کا انتظام کیا۔

اسی اثناء میں پانی پت کے لوگ بھی پہنچ گئے۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ قلندر صاحب کو پانی پت میں دفن کیا جائے مگر اہلِ کرنال کو اصرار تھا کہ کرنال ہی میں دفن کیا جائے۔ بالآخر پانی پت والوں کی بات مان لی گئی کیونکہ اُن کے ولی اور رشتہ دار ہونے کی وجہ سے حق فائق تھا۔ اس کے علاوہ اہلِ پانی پت کا کہنا تھا کہ حضرت قلندر صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنے مزار کی جگہ بھی پانی پت میں تجویز فرما دی تھی اور اس جگہ پر "سہ دابہ" بھی انہوں نے خود بنوا دیا تھا۔ الغرض آپ کا جنازہ کرنال سے پانی پت لے جایا گیا، جہاں آپ کی تجویز کردہ جگہ پر دفن کیا گیا۔

پانی پت سے کرنال آنے والوں میں مولانا سراج الدین مکّی اور حضرت بوعلی قلندر کے بھتیجے شیخ احمد بھی شامل تھے۔ شیخ احمد کے صاحبزادے شیخ محمد اور عبدالسلام چشتی کا بیان ہے کہ قلندر صاحب کی وفات کی خبر پانی پت میں مولانا سراج الدین مکّی کو بذریعہ کشف خود قلندر صاحب سے ملی، جو فرما رہے ہے:

"مولانا جلد تشریف لائیے۔ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو

چکا ہوں۔ میری نعش کو پانی پت لے آیئے اور میرے نام کا جو قبہ بنا ہوا ہے، وہاں دفن کر دیجئے۔"

مولانا سراج الدین کیؔ کو جونہی یہ خبر ملی، تو آپ فوراً جاگ اُٹھے۔ آپ نے شیخ احمد سے یہ واقعہ بیان کیا۔ اس کے بعد پانی پت کے مہاجر اور انصار خاندانوں کے برگزیدہ افراد کو جمع کیا اور ان کو ساتھ لے کر کرنال چلے آئے۔ یہ قافلہ طلوعِ آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد کرنال پہنچ گیا۔

مولانا سید محمد میاں صاحب کو اس بات سے شدید اختلاف ہے کہ مولانا سراج الدین کیؔ کو قلندر صاحب کی وفات کی اطلاع کشفی طور پر ملی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"صورت یہ ہوئی کہ ۹ رمضان کا دن گزار کر شب کو وفات ہوئی۔ ۱۰ کی شام کو اس کی اطلاع لکڑہاروں کے ذریعہ کرنال پہنچی۔ ۱۱ کی صبح کو کرنال کے حضرات بوڈھ کھیڑہ پہنچے اور شام تک جنازہ کو کرنال لائے۔ اب تک یہ خبر کرنال ہی تک محدود تھی۔ مگر کرنال کے حضرات نے رات گزار کر جیسے ہی صبح کو غسل دینا شروع کیا، پانی پت کے حضرات پہنچ گئے۔

سوال یہ ہے کہ جب خبر کا پہنچنا ممکن نہیں تھا اور جس قدر ممکن تھا، اس کا کوئی اہتمام بھی نہیں کیا گیا تھا، تو کیسے ہوا کہ شام سے لے کر صبح تک صرف رات رات میں پانی پت خبر پہنچ گئی اور نہ صرف خبر پہنچی بلکہ وہاں

کے حضرات چل بھی دیئے اور صبح کے وقت کرنال پہنچ بھی گئے۔ اُس زمانہ کے ذرائع کے لحاظ سے یہ سوال نہایئت اہم ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ یقین کر لیا گیا کہ کرنال سے پانی پت خبر پہنچانے کا ذریعہ "الہامی" تھا۔

لیکن "مفتاح الغیب" کے مؤلفین نے اس سے بھی بڑھ کے ایک روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ کرنال اور پانی پت کے لوگوں میں آپ کے جنازے کا جھگڑا جاری تھا اور کرنال کے لوگ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ مولانا سراج الدین مکّی نے جب یہ دیکھا کہ فریقین میں سے کوئی بھی اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہیں ہے، تو انھوں نے دونوں گروہوں کو مخاطب ہو کر فرمایا:

"آپ لوگ کیوں بے فائدہ جھگڑتے ہو۔ آؤ! اِس معاملہ میں حضرت کی لاش مبارک ہی سے فیصلہ لے لیں۔ جو ارشاد ہوگا، اس پر عمل کیا جائے گا۔ طرفین نے اس رائے کو تسلیم کر لیا۔"

مولانا سراج الدین مکی نے کہا کہ ایک تو قلندر صاحب کی مرغوب راگنی گائی جائے۔ اس راگنی کے دوران میں اگر قلندر صاحب کے جسم کو جنبش ہوئی، تو اہلِ پانی پت کا حق فائق۔ دوسرے قلندر صاحب کے جسدِ مبارک کو ہر دو فریق باری باری اٹھائیں جو اٹھالے وہ انہیں جہاں چاہے دفن کر دے۔ دوسرے دن صبح دونوں شرائط پانی پت والوں نے جیت لیں اور انہوں نے پانی پت کی راہ لی، جہاں ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ کے دن آپ کو دفن کر دیا گیا۔

یہی روایت سیّد محمد میاں صاحب نے "شرف المناقب" کے حوالے سے کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ مولانا سراج الدین مکی کے اس فیصلے پر سبھی رضامند ہو گئے کہ قلندر صاحب کی طرف رجوع کرنا چاہئیے۔ دن گزر گیا، رات آئی، تو دونوں فریق جنازہ کے گرداگرد بیٹھ گئے اور درود و قُل پڑھنے لگے۔ اُس وقت مولانا سراج الدین نے فرمایا:

"حضرت قلندر صاحب! فرمائیے، کیا مرضی ہے؟ مزار پانی پت میں بنے یا کرنال میں؟"

بہت دیر ہو گئی۔ کوئی بات نہیں کھلی۔ ٹھیک آدھی رات کا وقت تھا کہ حاضرین میں سے ہر شخص نے محسوس کیا کہ حضرت قلندر صاحب فرما رہے ہیں:

"دونوں شہر ہماری ولایت کے ماتحت ہیں۔ اس فقیر کا دونوں شہروں میں روزانہ گزر ہوتا ہے۔ بس آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ ہم اس جگہ بھی اور پانی پت میں بھی موجود ہیں۔"

اِس کے بعد قلندر صاحب نے فرمایا کہ مولانا سراج الدین صاحب جو ہدایت فرمائیں، اُس پر عمل کیا جائے۔" اس کے بعد مولانا نے وہی دو شرائط حاضرین کے سامنے رکھیں۔ جن میں اہلِ پانی پت کو کامیابی ہوئی اور وہ آپ کے جسدِ مبارک کو کرنال سے پانی پت لے گئے۔

ظاہر ہے کہ یہ روایت بھی محتاجِ نظر حکایتوں ہی سے ہے۔ اور باتوں کے علاوہ یہ

روایت اس لئے بھی قابلِ تسلیم نظر نہیں آتی کہ خود "مفتاح الغیب" اور "شرف المناقب" کا بیان ہے کہ مولانا سراج الدین مکی، شیخ احمد زندہ پیر اور ملک علی انصاری بھی اہلِ پانی پت کے ہمراہ آئے تھے۔ مولانا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ قلندر صاحب کے اساتذہ میں سے تھے۔ اس کے علاوہ خاص احباب میں سے بھی۔ شیخ احمد آپ کے برادر زادے تھے اور ملک علی انصاری مریدوں میں سرِ فہرست تھے۔ ایسی اہم شخصیتوں کی موجودگی میں اہلِ کرنال کا مسلسل انکار قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا جبکہ بلحاظ پیدائش و پرورش قلندر صاحب کے پانی پتی ہونے کے علاوہ قلندر صاحب کا وصال سے قبل خود پانی پت میں اپنی قبر کے لئے جگہ کا تجویز کرنا اور پھر اس پر "سہ دابہ" بنوانا بھی ثابت ہے۔ قصرِ عارفاں کے مصنف کے مطابق قلندر صاحب کا مزار سلطان علاء الدین خلجی کے بیٹوں (شادی خان اور خضر خان) کی زیرِ نگرانی ۷۹۵ھ میں پانی پت میں تعمیر ہوا۔ ان امور کے پیشِ نظر یہ بات دل کو لگتی ہے کہ معمولی اصرار و تکرار کے بعد اہلِ کرنال نے آپ کا جسدِ مبارک لے جانے کی اجازت دے دی ہوگی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مؤلف "تذکرہ اولیائے کرام" کا خیال ہے کہ حضرت بو علی قلندر کو کرنال میں ہی دفن کیا گیا تھا، لیکن اُن کے عزیز و اقارب نے ایک رات پوشیدہ طور پر ان کے جسدِ مبارک کو پانی پت میں لے جا کر دفن کر دیا۔ سید صباح الدین صاحب کے برعکس دوسرے قریباً سبھی تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کو کرنال میں ہرگز دفن نہیں کیا گیا تھا بلکہ قلندر صاحب شروع سے ہی پانی پت میں

مدفون ہیں۔

مزارِ مبارک

اوپر کی سطروں میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت بوعلی قلندر کو پانی پت شریف میں دفن کیا گیا، لیکن کئی دوسرے بزرگوں کی طرح آپ کا مزارِ مبارک ایک سے زیادہ مقامات پر موجود ہے۔ یعنی کرنال میں بھی آپ کا مزار موجود ہے اور بڈھ کھیڑہ اور باگھوتی کے مقامات پر بھی آپ کا عرس ہوتا ہے۔ چاروں جگہ عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عبدالسلام چشتی کی رائے ہے کہ کرنال میں واقع خانقاہ کو چونکہ آپ کی نشست گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے عقیدت مندوں نے یہاں بھی مزار بنا دیا۔ اس طرح بوڈھہ کھیڑہ کے مزار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ قبر پہلے موجود نہ تھی اور اب بجائے چبوترے کے وہاں قبر بنا دی گئی ہے۔ یہی حقیقت باکھوتی کے مزار کی ہے۔ اصل میں آپ کا روضۂ مبارک پانی پت میں ہے۔ کرنال، بڈھہ کھیڑہ اور باگھوتی میں مزارات کو ایک یادگار سے زیادہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

آپ کے مقبرے کی تعمیر سلطان علاء الدین خلجی کے حکم سے شروع کی گئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا، شہزادہ شادی خان اور شہزادہ خضر خان نے آپ کا مزار ۷۶۹ھ میں اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں موضع ہرتاری کے متولی جناب نواب ناصر احمد خان انصاری پانی پتی نے مزار پر سنگِ مرمر کا کام کرایا۔ اس وقت سارے کا سارا

مزار سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں سیٹھ ابراہیم حاجی عرب بمبئی والے نے گنبد کا کلس سونے کا بنوا دیا، اور دالان میں بھی سنہری کام کرا یا۔ ۱۹۱۶ء میں موضع پاو ٹی اور ہرتاڑی کے محاصل سے گلال باڑ کا اندرونی فرش بنایا گیا۔ یہ کام جناب بقاء اللہ صاحب کی سعی سے تکمیل کو پہنچا۔ تعویذِ مزار کے اوپر منقش چوبی سائبان سا بنا ہوا ہے۔ چوبی کٹہرے سے متعلق "مفتاح الغیب" کا بیان ہے کہ یہ کٹہرہ پہلے چاندی اور سونے کا بنا ہوا تھا، لیکن نادر شاہ درانی جب ہندوستان آیا، تو اس نے کہا کہ یہ قلندر نہیں بلکہ تونگر ہے۔ یہ کہہ کر نادر شاہ نے اپنی تلوار کٹہرے پر رکھ دی۔ یہ دیکھ کر اُس کے لشکریوں نے کٹہرے پر لگے ہوئے سونے چاندی کو اُتار لیا۔ یہ مشہور ہے کہ نادر شاہ اور اُس کے سپاہیوں کی یہ حرکت قلندر صاحب کی ناراضگی کا باعث بنی اور یہی وجہ تھی کہ نادر شاہ زیادہ دیر تک ہندوستان میں نہ ٹھہر سکا۔ روضے کی چوکھٹ طبی رنگین اور منقش لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ اِس کی چاروں دیواروں میں دریچے بنے ہوئے ہیں۔

مزار کے شمالی جانب وسطی دیوار میں ایک دروازہ بنا ہوا ہے۔ اِس دروازے سے نکلیں تو شہزادہ مبارک خاں کے مزار کا گنبد نظر آتا ہے۔ شہزادہ مبارک خاں آپ کے عزیز ترین مریدوں میں سے تھے۔

حضرت بو علی قلندر صاحب کے مزار کے بیرونی دروازے پر خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر درج ہے:

برزمینے کہ نشانِ کفِ پای تو بود

سالہا سجدہ گہِ صاحب نظران خواہد بود

مزار کے پائیں میں کٹہرے کے ساتھ ایک چوکھٹا آویزاں ہے، جس میں پنڈت امرناتھ آشفتہ پانی پتی کے قصیدے کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ آشفتہ کا وہ قصیدہ حسبِ ذیل ہے:

اے ہادیِ راہِ ہدا، اے دوستدارِ انبیاء
صلّی علیٰ، صلّی علیٰ، اے دوستدارِ انبیاء

اے بخشیِ ہند، اولیاء، مقبولِ ربِّ کبریا
اے مخزنِ جود و سخا، اے دوستدارِ انبیاء

اے از گروہِ احمدیؐ، شاہِ قلندر بو علی
محبوبِ محبوبِؐ خدا، اے دوستدارِ انبیاء

اے دافعِ رنج و بلا، اے شافعِ روزِ جزا
اے صاحبِ حاجت روا، اے دوستدارِ انبیاء

اے ساکنِ خلدِ بریں، منظورِ ختم المرسلینؐ
مرغوبِ شاہِ مرتضیٰؓ، اے دوستدارِ انبیاء

اے شاہِ شرفِ اولیاء، اے واصلِ نورِ خدا
اے مظہرِ شمس الضحیٰ، اے دوستدارِ انبیاء

اے دستگیرِ بے کساں، کُن پیشِ آں حضرت بیاں

بہرِ خدا این التجا، اے دوستدارِ انبیاء

خاکِ درِ ذی جاہِ تو، خار و خسِ درگاہِ تو

صد فخر و زیبِ فرقِ ما، اے دوستدارِ انبیاء

آوارہ و سرگشتہ ام، از خان و مان وارستہ ام

دستِ عنایت برکشا، اے دوستدارِ انبیاء

آشفتہ ام بے بال و پر، بر حالِ زارم کن نظر

اے بو علی، مشکل کشا، اے دوستدارِ انبیاء

یہ قصیدہ ۱۲۹۶ھ میں لکھا گیا اور اس بات کا مظہر ہے کہ حضرت بو علی قلندرؒ سے صرف مسلمانوں کو ہی عقیدت کا تعلق نہ تھا بلکہ دوسری اقوام و مذاہب کے لوگ بھی متوازی طور پر آپ سے ارادت رکھتے تھے۔

مزار کے اندر مغربی دیوار پر جناب بقاء اللہ صاحب کا یہ قطعۂ عقیدت درج ہے:

بر درِ درگاہِ شاہِ شرف ہر کہ آمد بہ اعتقادِ درست

شاہد و مدعا و مطلبِ خویش از دعایش گرفت و بر درجست

بعہدِ جہانگیر بادشاہ ۱۰۶۶ء میں رزق اللہ خاں نے مزار میں توسیع کرائی اور لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک بڑا دالان بنوایا، جس کا فرش سنگِ مرمر کا اور دیواریں دوسرے پتھروں سے بنوائیں۔ دیواروں میں اندرونی جانب قرآنی آیات اور قطعات درج کرائے۔ اس کے علاوہ سنگِ محک کے آٹھ ستون بھی نصب کرائے۔ اِس دالان کی دیوار

پر سیاہ اور سنہری حرفوں میں یہ قطعۂ تاریخ لکھا ہوا ہے:

مظہرِ نورِ جلال است و جمال | ہمچو عیسیٰ مردہ را بخشد روان
از مقرب خانِ افلاطونِ دہر | خان بن خان است رزق اللہ خان
بو علی چون بو علی سینا ش کرد | زان شرف گشتہ ارسطوی زمان
تا بنا فرمود ایوان را چو خلد | ہر ستون سنگِ محک در زیرِ آن
از خرد جستم بنای سالِ او | چون طلای کیمیا کردم عیان

سالِ تاریخ و بنایش در حساب
شد بہ والا جاہ رزق اللہ خان

اس کے علاوہ ظہور کے مندرجہ ذیل اشعار بھی دالان کی دیوار پر درج ہیں:

سرمۂ خاکِ درت در چشمِ مہرِ خاوری | سایہ جبین بر آسمان دائم سپہرِ چنبری
اے خواجہ و پیر و ولی، شاہِ شرف بو علیؒ | نورِ کرامت منجلی را چار سوی عنصری
محبوبِ ذاتِ کبریا، مقبولِ شاہِ مصطفیٰؐ | شمعِ جمالِ اولیا، چون ماہ و مہرِ انوری
دیوار از حکمت روان، انوارِ حق در آن عیان | جای تو فردوس و جنان با عز و شانِ حیدری

آمد ظہورِ بے نوا، بر آستانت جبہ سا
رحمے بکن بہرِ خدا، شاہا! مسافر پروری

درگاہ کے مغرب میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے، جس پر سنگِ سرخ لگایا گیا ہے۔ یہ بھی نواب صاحب نے ہی بنوائی تھی۔ مسجد کے سامنے ایک حوض بھی ہے۔ درگاہ میں

بہت سے حجرے مسافروں کی رہائش کے لئے بنائے گئے ہیں۔ صحن درگاہ بڑا وسیع ہے۔ اس کے درمیان میں ایک کنواں ہے۔ درگاہ شریف کے دو دروازے ہیں۔ ایک شمال میں ہے اور دوسرا جنوب کی طرف۔ شمالی دروازے کے اندر ایک خوبصورت مسجد ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شہزادہ مبارک خان کی تعمیر کردہ ہے۔ جنوبی دروازے میں مجذوبوں اور فقیروں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ درگاہ شریف سے باہر قلندر صاحب کا نقار خانہ ہے، جسے نواب لطف اللہ خان نے ۱۱۳۵ھ میں بنوایا تھا۔ اس کی تاریخ تعمیر "درجہان کوس شرف زد صادق" سے نکلتی ہے۔

کہتے ہیں کہ قلندر صاحب نے وصیت کی تھی کہ جو کوئی میری زیارت کے لئے آئے، وہ پہلے مبارک خان کے مزار پر فاتحہ خوانی کرے۔ چنانچہ اب تک زائرین پہلے شہزادے کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں، پھر قلندر صاحب کے ہاں حاضری دیتے ہیں۔

قلندر صاحب کے احاطۂ درگاہ میں چبوترے کے جنوب کی طرف ایک جالی دار آہنی کٹہرا ہے، جس کے اندر ہمارے محبوب شاعر جناب شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کی آخری آرامگاہ ہے۔

تصانیف

دیوان

حضرت بو علی قلندر کی غزلوں کا ایک مختصر سا مجموعہ برصغیر کے متعدد شہروں سے کئی مرتبہ چھپا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے لاہور اور سیالکوٹ کے چھپے ہوئے دو نسخے موجود ہیں۔ لاہور والا نسخہ ۸۸ غزلیات پر مشتمل ہے جبکہ سیالکوٹ کے نسخے میں ۸۹ غزلیں شامل ہیں۔ اوّل الذکر میں حسبِ ذیل مطلعے والی غزل نظر نہیں آتی باقی تمام غزلیں دونوں میں مشترک ہیں :

رُخِ او نورِ مقدّس، لبِ او روحِ مُصفّا
جعدِ او افعیِ موسیٰ، کفِ او چو یدِ بیضا

ان دونوں مطبوعہ نسخوں کے برعکس دانشگاہِ پنجاب سکے ذخیرۂ شیرانی میں موجود دیوانِ قلندر کا مخطوطہ صرف ۵۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں غزلوں کے علاوہ دو قصیدے، چار رباعیاں اور دو قطعے بھی ہیں۔ ایک قصیدہ غیاث الدین بلبن کی تعریف میں ہے۔ دوسرے قصیدے کا ممدوح واضح نہیں ہے۔

اس دیوان میں ۳۸ غزلیں ایسی ہیں، جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتیں۔ اِس طرح اگر اِن غیر مطبوعہ غزلوں کو بھی شامل کر لیا جائے، تو غزلیات کی تعداد ۱۲۷ ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ مشترک غزلوں کے اشعار میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ گویا تعداد اشعار بھی بڑھ سکتی ہے۔ اس کے باوجود ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کام میں مکمل احتیاط اور تحقیق سے کام لیا جائے کیونکہ مطبوعہ نسخوں میں بعض ایسے مصرعے بھی نظر آتے ہیں، جو بعد کے شعراء کے ہاں بھی کچھ ردّوبدل کے ساتھ موجود ہیں۔ مثلاً حافظ شیرازی اور قلندر صاحب کے مطبوعہ دواوین میں یہ مصرعہ معمولی تغیر کے ساتھ ملتا ہے:

حافظ: مانمی خواہیم ننگ و نام را

قلندر صاحب: مانمی خواہیم ہرگز نام و ننگ

اس طرح حافظ کا مشہور شعر:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قلندر صاحب کے دیوان میں اس طرح ہے:

مردہ ہرگز نبود آنکہ بمیرد در عشق
کشتۂ نازِ ترا زندہ دائم شمیریم

ظاہر ہے کہ اس شعر میں دونوں کے ہاں پہلے مصرعے تو حرف و صوت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے بیحد قریب ہیں۔ البتہ دوسرے مصرعوں میں الفاظ کی بجائے مفہوم ایک سا ہے۔ اب ان دونوں میں سے کون کس سے متاثر ہے۔ اور قلندر صاحب یا حافظ صاحب کے ہاں الحاقی اشعار کون کون سے ہیں۔ یہ بات

فی الحال موضوعِ بحث نہیں ۔

کوئی باہمت دیوانِ قلندر کو صحیح خطوط پر مرتب کر دے تو بہت بڑی خدمت ہو گی کیونکہ حکیم و شاعرِ ملت علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی پہ خود حضرت قلندر صاحب اور ان کے افکار کا پر تو واضح طور پر نظر آتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ مرحوم کی قلندرانہ شوکت کے سوتے حضرت بو علی قلندر کے چشمۂ فیض ہی سے پھوٹے تھے ۔

مثنوی

قلندر صاحب کی مثنوی اپنے موضوع کے اعتبار سے عارفانہ مثنویوں میں سے ہے۔ مضامین و مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت مولانا جلال الدین بلخیؒ رومی کی مثنوی سے بیحد متاثر ہیں ۔ وزن بھی وہی استعمال کیا ہے ۔ جا بجا مثنویِ معنوی کے مطالب سے استفادہ بھی کیا ہے ۔ اس کے علاوہ مولانا کے اشعار کو بھی علامہ اقبالؒ کی طرح اپنی مثنوی میں شامل کیا ہے ۔ مثلاً حسبِ ذیل شعر :

ہم خدا خواہی و ہم دنیایِ دون
این خیال است و محال است جنون

قلندر صاحب اس مثنوی میں علائقِ دنیوی سے نفرت اور خدائے ذوالجلال سے دل لگانے کی تعلیم دیتے ہیں ۔ عبادات میں خلوص اور خضوع و خشوع کی تلقین کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ کسبِ رزقِ حلال ، ترکِ غفلت ، باہمی دوستی ، مہر و وفا ،

اخوت و مروت کا درس بھی دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ دنیا سے مہر و وفا کا نام اُٹھ گیا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں شرم و حیا نہیں رہی۔ نیک لوگوں کی شکل و صورت مبتدل ہو گئی۔ حلم اور رواداری کے ملک میں خلل واقع ہو گیا۔ جہاں کبھی سخاوت کا دور دورہ تھا۔ اب وہاں قحط سالی کی حکومت ہے۔ مہر و محبت کی کھیتیاں خشک ہو گئیں۔ ماؤں اور بیٹیوں میں صبح و مسا لڑائی رہتی ہے۔ اور ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں، جن پر حضرت بوعلی کا قلم خون کے آنسو بہاتا چلا جاتا ہے۔

عام طور پر یہ مثنوی "مثنوی بوعلی قلندر" کے نام سے مشہور ہے اور اسی نام سے چھپتی رہی ہے۔ لیکن کتابخانۂ دانش گاہِ پنجاب کے ذخیرۂ آذر میں ایک نسخہ "مثنوی بلبل و طوطی" کے نام سے بھی ملتا ہے۔

رباعیات

ایک مختصر سا مجموعہ آپ کی رباعیات کا بھی ملتا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں کل چودہ رباعیاں ہیں۔ زبان بے حد سادہ، رواں اور شیریں ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی محبت کا رنگ ہر رباعی میں نظر آتا ہے۔ دوسروں کو پند و نصیحت کی ہے مگر بڑے ہی دلکش، دھیمے اور مؤثر انداز میں۔

رسالہ سرالعشق

یہ رسالہ ابھی تک غیر مطبوعہ صورت میں ہے۔ اس کی ضخامت سو صفحات کے

لگ بھگ ہے۔ اس رسالے کا موضوع بھی تصوّف و معرفت ہی ہے۔ اس میں عشق اور فقر کے مدارج پر بحث کی گئی ہے۔ مضامین کو چھوٹی چھوٹی فصول میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ اندازِ بیان بڑا عالمانہ ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے اس رسالے کی نثر مقفّیٰ اور دلنشیں ہے۔ آیات و احادیث، اقوالِ صوفیاء اور اساتذہ کے اشعار سے عبارت مزیّن ہے۔ مضامین و معانی کے بیان میں ایک خاص تسلسل اور تواتر کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر یہ رسالہ اپنے اندر قاری کے لئے بہت سی دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔

رسالہ عشقیہ

ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ غالباً یہ بھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کا مطبوعہ نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ موضوع کے اعتبار سے یہ رسالہ "سِرّ العشق" سے ملتا جلتا ہے اور اسلوب بھی وہی ہے۔

اسرار العاشقین

یہ رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ مفتاح الغیب میں اس کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس کے موضوع وغیرہ پر کچھ نہیں لکھا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس کا تعلق بھی سر العشق اور رسالہ عشقیہ کی کڑی سے ہوگا۔

مکتوبات

حضرت قلندر صاحب کے مکتوبات کا ایک مخطوطہ دانشگاہِ پنجاب لاہور کے کتابخانے میں موجود ہے۔ اس میں ۱۴۸ کی تعداد میں مکتوبات شامل ہیں۔ یہ تمام کے تمام ایک ہی شخص کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہ کا نام "اختیارالدین" ہے۔ "مفتاح الغیب" نے لکھا ہے کہ اختیارالدین قلندر صاحب کے بھتیجے اور مرید تھے۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر مکتوب کا آغاز "برادرم اختیارالدین بداند" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔

بسا اوقات خط کے درمیان میں بھی مکتوب الیہ کو پھر سے مخاطب کیا ہے اور پھر پند و نصائح کے پُر مغز باب کھولے ہیں۔ ان خطوط کا نفسِ مضمون تصوّف و معرفت ہے۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی فرماتے ہیں کہ قلندر صاحب کے مکتوبات توحید، ترکِ دنیا، طلبِ آخرت، محبتِ مولیٰ کے حقائق و معارف سے پُر ہیں اور ان کی زبان عشق و محبت کی زبان ہے۔

افسوس ہے کہ یہ بے حد مفید اور نادر مجموعہ ابھی تک نہیں چھپا۔

رسالۂ سلوک

یہ رسالہ منازلِ سلوک اور مراحلِ فقر و درویشی کے بیان میں ہے۔ قلندر صاحب

نے سلوک اور درویشی پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ امیرالمؤمنین حضرت علیؓ سے روحانی طور پر کسبِ فیض کرنے اور بیعت کا شرف حاصل کرنے کا واقعہ بھی اسی رسالے میں لکھا ہے۔

رسالۂ توحید

کتابخانۂ دانشگاہِ پنجاب کے ذخیرۂ شیرانی میں یہ رسالہ موجود ہے۔ یہ مخطوطہ ۴، جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ کا کتابت شدہ ہے۔ رسالے کا متن سوال و جواب کی طرز پر ہے اور موضوع معرفتِ ذاتِ باری تعالیٰ اور ذاتِ آدمی ہے۔ کچھ سوالات کا تعلق الٰہیات سے ہے۔ چند سوالات کا ترجمہ نمونے کے طور پر درج کیا جاتا ہے:

۱۔ ذاتِ خداوند تعالیٰ کہاں ہے؟

۲۔ جب خدا ذاتِ آدم ہے، کیا آدمی کو بھی خدا تعالیٰ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

۳۔ ذات اور صفات سے کیا مراد ہے؟

۴۔ کیا کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں کبھی دیکھا یا نہیں؟

اس رسالے میں حضرت نور قطب عالم اور حضرت شاہ مدار وغیرہم کا ذکر بھی آتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا زمانہ نویں صدی ہجری کا نصفِ اوّل ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس رسالے کی نسبت حضرت بو علی قلندر صاحب سے غلط قرار پائی ہے۔

حکم نامہ

مختلف تذکروں نے آپ کی ایک اور تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ کسی نے اس کا نام حکمنامہ لکھا ہے، تو کسی نے حکمت نامہ۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی "اخبارالاخیار" میں فرماتے ہیں کہ آپ کا ایک اور رسالہ عوام میں شہرت رکھتا ہے۔ اسے "حکمنامۂ شیخ شرف الدین" کہا جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ عوام کی اختراعات میں سے ہے۔

"مفتاح الغیب" کا قیاس ہے:

"آپ کی تصنیف سے حکم نامہ بھی ہے، لیکن شوخیِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور کے کسی خادم کا مکمل کردہ ہے۔"

"مفتاح الغیب" کے بیان میں ابہام موجود ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ رسالہ شروع تو خود حضرت قلندر صاحب نے کیا تھا مگر اس کی تکمیل کسی دوسرے شخص کے ہاتھوں ہوئی۔

بہرصورت رسالے کی تحریر کا انداز خودنوشت سوانح کا ہے۔ یہ رسالہ مطبوعہ صورت میں نظر نہیں آیا۔ کتابخانۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست میں ایک خطی نسخے کا ذکر ملتا ہے۔ اس رسالے میں بعض معاصر حضرات کے نام بھی ملتے ہیں۔ مثلاً شہزادہ جلال الدین فیروز، شہزادہ علاءالدین محمد، شہزادہ خضرخاں اور مولانا سراج الدین رکوئی وغیرہ۔

رسالے کے دوسرے مخطوطے کا ذکر مولانا سید محمد میاں صاحب نے کیا ہے۔ یہ

نسخہ مولانا بقاء اللہ صاحب پانی پتی کی ملکیت ہے، جو پانی پت میں مقیم بزرگانِ گرامی میں سے ہیں۔ مولانا بقاء اللہ صاحب کے اس نسخے کی ضخامت صرف پانچ صفحات بتائی گئی ہے۔ اس میں دو غزلیں بھی درج ہیں، جو قلندر صاحب نے زکریا نامی ایک شخص سے سنی تھیں۔ دونوں غزلوں کے مطلعے علی الترتیب یہ ہیں:

(۱)

ساربان با اشتران مست در رفتار مست

میر مست و خواجہ مست و یار مست، اغیار مست

(۲)

با صورتِ آدم نبرد سجدہ عزازیل

زان مدعی آرد بتو در سجدہؐ ما قیل

پہلی غزل میں کل پانچ شعر ہیں اور دوسری پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ ۱۹ شعبان المعظم ۱۲۳۶ھ کو یعنی جمعے کے دن کا کتابت شدہ ہے۔

ذوالفقار لودھی کا بیان ہے کہ "گلزارِ ابرار" میں محمد غوثی نے حضرت بوعلی قلندر کے حالات میں رسالہ "حکمنامہ" کو من و عن نقل کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس رسالے میں مذکور واقعات تو صحیح معلوم ہوتے ہیں، لیکن بعض کرامات اور مافوق الفطرت واقعات مریدوں کی کرامات معلوم ہوتے ہیں۔ لودھی صاحب نے اگرچہ واضح رائے دینے سے اجتناب برتا ہے اور رسالے کی نسبت اور حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش

نہیں کی پھر بھی ان کے بیان سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ رسالے "حکمنامہ" کا کچھ حصّہ بیدوں کا لکھا ہُوا ہے اور یہ حصّہ کرامات اور مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ہے۔ اور سوانحی حصّہ قلندر صاحب کا خود نوشت معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ "گلزارِ ابرار" ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ البتہ اس کتاب کا اردو ترجمہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جو فضل احمد صاحب نے "اذکارِ ابرار" کے نام سے کیا تھا، لیکن "اذکارِ ابرار" میں "حکمنامے" کا قریباً صفحے ڈیڑھ صفحے کے برابر ایک اقتباس کا ترجمہ موجود ہے، جس سے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ قریباً سبھی حضرات نے اس نسخے کی قلندر صاحب سے نسبت پر شک کیا ہے، اس کے باوجود آپ کی سوانح لکھتے ہوئے جا بجا بڑی کثرت سے اس کے حوالے دیئے ہیں۔

حضرت بو علی قلندر اور معاصر سلاطین

حضرت بو علی قلندر نے ایک سو بائیس (۱۲۲) سال کی طویل عمر پائی۔ آپ کی زندگی میں ملکی سیاست نے کئی کروٹیں لیں اور بہت سے انقلابات سے برِ صغیر کو دوچار ہونا پڑا۔ یکے بعد دیگرے تین خاندانوں نے دہلی پر حکومت کی۔ اس لمبے عرصے میں رونما ہونے والے حالات وواقعات سے تاریخِ برِ صغیر کا دامن بھرا پڑا ہے۔ یہاں مجمل طور پر ان سلاطین کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کا تعلق حضرت قلندر صاحب سے رہا ہے۔ اس ضمن میں برائے نام تذکرہ ان حکمرانوں کا بھی ہوگا، جن کا بظاہر آپ سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر تاریخی تسلسل کی خاطر اُن کا ذکر ضروری سمجھا گیا۔

قلندر صاحب کے سلاطینِ دہلی سے تعلقات کی ابتدا ۶۴۲ھ (۱۲۴۴ء) کے بعد ہوتی ہے، جبکہ آپ بعمر ۴۰ سال پانی پت سے دہلی تشریف لائے اور مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت دہلی میں خاندانِ ملوک کا پانچواں حکمران سلطان علاءالدین مسعود بر سرِ اقتدار تھا۔ سلطان مسعود کو ۶۴۴ھ (۱۲۴۶ء) میں معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان ناصرالدین محمود نے ۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) تک مسلسل بیس برس حکومت کی۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں آپ کو مفتی کا عہدہ حاصل رہا، اور مسجد قوۃ الاسلام میں درس وتدریس کی بدولت آپ کے علم وفضل کا شہرہ چار سو

ہؤا۔ان بادشاہوں کی آپ سے عقیدت وارادت کی کوئی خاص شہادت نہیں ملتی ۔

غیاث الدین بلبن

بلبن بادشاہ بننے سے پہلے اُلغ خان کے خطاب سے مشہور تھا۔خاندانی اعتبار سے بلبن کا التمش کے قبیلے کا ہی فرد تھا۔اس کا باپ اپنے قبیلے "البری" کا سردار تھا۔چنگیز خاں کے حملے کے وقت کسی مغل سپاہی نے اسے گرفتار کر لیا ،جس نے بلبن کو بغداد کے ایک شخص جمال الدین کے پاس فروخت کر دیا۔اس کے بعد بلبن کو دہلی کے بازار میں فروخت کر دیا گیا۔بلبن بیحد ذہین اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔معمولی سپاہی کی حیثیت سے ملازم ہؤا۔رفتہ رفتہ ترقی کر کے میرِ شکار اور ترکانِ چہل گانی کے زمرے میں داخل ہؤا۔سلطان التمش کی اولاد کی تخت نشینی اور ان کی حکومت کے کاروبار میں اس نے مؤثر کردار ادا کیا۔وہ ناصرالدین محمود کے عہد میں سلطان کا نائب السلطنت بنا اور سرکش امراء کی بیخ کنی میں کامیاب ہؤا۔

۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں ناصرالدین محمود لاولد فوت ہو گیا، تو اُلغ خاں غیاث الدین بلبن کے لقب سے تخت کا وارث بنا۔بلبن حکومت کرنا خوب جانتا تھا۔فنِ سپاہ گری اور انتظامِ ملکی کا ماہر تھا۔وہ شاہی رعب داب اور عظمت وجلال کو کامیاب حکومت کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔عدل وانصاف اور حق کی حمایت میں بڑا سرگرم تھا اور اس سلسلے میں سخت سے سخت اقدام سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔

ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کو علماء اور صوفیاء سے بیحد عقیدت تھی۔ اس کے عہد میں مولانا برہان الدین، مولانا نجم الدین دمشقی، مولانا برہان الدین بزاز، قاضی رفیع الدین گازرونی، قاضی سدید الدین، قاضی جلال الدین کاشانی اور منہاج الدین جرجانی جیسے عظیم علماء کے نام آتے ہیں۔ وہ مشائخ کرام کا بڑا احترام کرتا تھا۔ بابا فرید گنج شکر اور شیخ علی چشتی سے بلبن کی عقیدت کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔

"مفتاح الغیب" کا بیان ہے کہ بلبن کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ اس نے حضرت بوعلی قلندر کی طرف رجوع کیا۔ آپ کی دعا سے بادشاہ کو چار بیٹے عطا ہوئے۔ سب سے بڑا شہزادہ مبارز خاں قلندر صاحب سے بیحد عقیدت وارادت رکھتا تھا۔ وہ اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ قلندر صاحب غیاث الدین بلبن کی عدل گستری، حق پرستی اور نیک خوئی سے بڑے خوش تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس بادشاہ کی تعریف میں کہا :

شہِ اعظم غیاث الدین کہ از دانش مشرف شد
یکے بخت و یکے تخت و یکے خاتم، یکے افسر
چو او شاہے درعالم در نیامد از عدم بیشک
یکے عادل، یکے باذل، یکے ضابط، یکے داور

علاء الدین خلجی

غیاث الدین بلبن کی وفات (۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء) کے بعد معز الدین کیقباد اور

شمس الدین کیومرث بالترتیب تختِ دہلی پر متمکن ہوئے۔ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں حاکم سامانہ جلال الدین فیروز خلجی نے شمس الدین کیومرث کو معزول کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے ساتھ ہی سلاطینِ شمسی کا دور ختم ہو گیا۔ ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء) میں خلجی خاندان کے بانی جلال الدین فیروز کو ہلاک کر دیا گیا۔ جلال الدین فیروز بڑا منکسر مزاج، رحمدل اور نیک طبع انسان تھا۔ اگرچہ حضرت بوعلی قلندر سے سلطان جلال الدین فیروز کے تعلقات چنداں روشنی میں نہیں ہیں، لیکن قیاس یہی چاہتا ہے کہ اُسے قلندر صاحب سے ارادت کا شرف ضرور حاصل ہوگا۔

سلطان جلال الدین خلجی کے بعد اس خاندان کے عظیم بادشاہ سلطان علاءالدین خلجی کا دور آتا ہے۔ یہ شخص بڑا دلیر اور جنگجو تھا۔ فنِ سپاہ گری اور ملکی نظم و نسق میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ بیس سال تک بڑے کرّوفر سے حکومت کرنے کے بعد سلطان علاءالدین کو بیماری نے آلیا۔ بالآخر ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

برّصغیر کی تاریخ میں سلطان علاءالدین کو یہ شرف اور اوّلیت بھی حاصل ہے کہ اُس نے نہ صرف خود شراب نوشی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا بلکہ ملک میں شراب نوشی کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ "مفتاح العیب" میں لکھا ہے کہ حضرت قلندر صاحب کے باطنی تصرّف کے طفیل ہی سلطان نے شراب نوشی کی عادت ترک کی تھی اور قلندر صاحب نے خواب میں سلطان علاءالدین کو تنبیہ کی تھی کہ وہ بندگانِ خدا کے ساتھ اچھا سلوک روا

رکھے۔ اپنے آپ کو تمام شرعی ممنوعات سے دور رکھے اور دوسروں کے لئے بھی سخت احکامات جاری کرے تاکہ وہ بھی بُری عادات سے باز آ جائیں۔ اس کے برعکس "تاریخ مبارک شاہی" کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک رات شراب کی مجلس گرم تھی۔ سلطان علاء الدین نشے میں بدمست تھا۔ اُس نے اسی حالت میں قاضی بہا کو قتل کرنے کا حکم دیا صبح ہوش آیا، تو قاضی صاحب کو دربار میں بُلا بھیجا۔ سلطان کو جب بتایا گیا کہ قاضی صاحب کو رات آپ کے حکم سے قتل کیا جا چکا ہے، تو سلطان کو بیحد قلق ہوُا۔ چنانچہ سلطان نے اسی وقت یہ فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی اس دشمنِ ہوش و خرد کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

بہرحال یہ بات مسلّم ہے کہ علاء الدین خلجی اولیائے کرام اور مشائخ اسلام کا بڑا احترام کرتا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے "اعجازِ خسروی" میں اس بات کی تصدیق فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ وہ صوفیا اور مشائخ کا بڑا معتقد تھا۔ "طبقاتِ اکبریؒ" کے مؤلف لکھتے ہیں کہ علاء الدین جب کڑہ میں حاکم تھا، تو ایک دن خواجہ کڑکؒ کی خدمت میں حاضر ہوُا۔ خواجہ نے علاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

ہر کس کہ کُند با تو جنگ
سر در کشتی، تن در گنگ

یہ واقعہ اکثر تذکروں اور تاریخوں میں ملتا ہے کہ ایک بار سلطان علاء الدین خلجی نے حضرت بو علی قلندر کی خدمت میں کچھ نذرانے بھیجنے کا ارادہ کیا۔ سلطان قلندر صاحب کی ہیبتِ جلالی سے خوب واقف تھا۔ اس لئے اُسے کچھ سوجھائی

نہ دیتا تھا کہ کس شخص کو قلندر صاحب کی خدمت میں بھیجا جائے۔ تمام امراء نے سلطان کو یہ مشورہ دیا کہ سوائے حضرت امیر خسرو کے یہ کام اور کسی کے بس کا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو سے کہا گیا کہ وہ قلندر صاحب کی خدمت میں سلطان کے تحائف لے جائیں، لیکن حضرت امیر خسرو کو تامل ہُوا کہ وہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی اجازت کے بغیر وہاں نہیں جا سکتے۔ اس پر سلطان نے ایک امیر کو حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں بھیج کر اجازت چاہی۔ انہوں نے کچھ سوچ بچار کے بعد حضرت امیر خسرو کو قلندر صاحب کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔

امیر خسرو سلطان کا نذرانۂ عقیدت لے کر پانی پت روانہ ہو گئے۔ تیسرے دن پانی پت پہنچے۔ دربارِ قلندری میں آپ کا استقبال بڑی شفقت اور محبت سے کیا گیا۔ قلندر صاحب نے اِن سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ حضرت امیر نے اپنی ایک غزل قلندر صاحب کی خدمت میں پیش کی جس کا مطلع حسبِ ذیل ہے:

اے کہ گوئی ہیچ مشکل چون فراقِ یار نیست
گر امیدِ وصل باشد ہمچناں دشوار نیست

حضرت قلندر صاحب یہ غزل سُن کر بہت خوش ہوئے اور حضرت امیر خسرو کو دعا دی۔ پھر اپنی غزل سنائی جو اس مطلع سے شروع ہوتی ہے:

دیہیمِ خسروان برِ ما لعل استراست
خسرو کسے کہ خلعتِ تجرید برسراست

یہ سُن کر حضرت امیر خسرو پر رقت طاری ہو گئی۔ یہ دیکھ کر حضرت بوعلی نے فرمایا کہ کچھ سمجھے بھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ اسی لئے تو روتا ہوں کہ کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ امیر خسرو کے اس جواب پر قلندر صاحب اور بھی خوش ہوئے۔ انہوں نے بادشاہ کے تحائف قبول کر لئے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر مولانا نظام الدین درمیان نہ ہوتے، تو ہرگز یہ تحفے قبول نہ کرتا۔ قلندر صاحب کی خواہش پر حضرت امیر خسرو نے تین دن پانی پت میں قیام کیا۔ تیسرے روز خسرو روانہ ہونے لگے، تو قلندر صاحب نے آپ کو دو خط لکھ کر دیئے۔ ان میں سے ایک حضرت نظام الدین اولیاء کے نام تھا اور دوسرا سلطان علاء الدین کے نام۔

قلندر صاحب نے سلطان کے نام خط میں اور باتوں کے علاوہ یہ الفاظ تنبیہ کے طور پر لکھے :

"علاء الدین خوطۂ دہلی، مکرر داند کہ با بندگانِ خدائے تعالیٰ زندگانی نیکو کند۔"

اور اس طرح سلطان کو اس کا فرض یاد دلایا کہ اُسے ہر وقت رعایا کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیئے۔

حضرت امیر خسرو دونوں خط لے کر دہلی آئے۔ بادشاہ کے نام کا خط دربار میں پڑھا گیا۔ خط کی مذکورہ بالا عبارت کے پیشِ نظر بعض موقع پرستوں نے بادشاہ کو قلندر صاحب کے خلاف اُکسانا چاہا اور کہا کہ سلطانِ عالی کے لئے ایسے حقیر الفاظ کا

لکھنا ترکِ ادب اور گستاخی کو ظاہر کرتا ہے، لیکن وہ سمجھدار تھا۔ اُس نے ان خوشامدی مصاحبوں سے کہا کہ شکر ہے کہ جو انہوں نے اس مرتبہ مجھے خوطۂ دہلی کہا وگرنہ اس سے پہلے تو شحنۂ دہلی کہا کرتے تھے۔

سلطان علاءالدین خلجی کے عہد کا حسبِ ذیل واقعہ بھی علی شیر قانع اور امین احمد رازی نے اپنے تذکروں میں بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بوعلی قلندر کا ایک مرید آپ کی محبت میں سرمست و بیخود بازار جا رہا تھا۔ اُسے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ تھی، اسی اثناء میں شہر کے عامل کی سواری بھی ادھر سے گزر رہی تھی۔ حاکم شہر کے ہمراہ غلاموں اور چوبداروں کا ایک گروہ بھی تھا۔ اس جماعت کے ایک آدمی نے قلندر صاحب کے مرید کو آواز دے کر کہا کہ ایک طرف ہٹ جا اور حاکم شہر کی سواری کا راستہ نہ روک۔ وہ مرید چونکہ دنیا و مافیہا سے بے خبر جا رہا تھا، اس لئے اُسے عامل کے کارندے کی آواز کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اس پر کارندے نے اُس بے چارے کو بُری طرح پیٹا۔ اذیت خوردہ وہ مرید حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا، اور آپ کو اس واردات سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

حضرت بوعلی نے جب یہ سنا کہ عامل کے چوبدار نے بغیر کسی وجہ کے آپ کے ایک خادم کو مارا ہے، تو آپ کو بیحد دُکھ ہُوا۔ آپ نے اسی وقت ایک جلالی فرمان لکھ کر سلطان علاءالدین کو بھجوایا، جس میں لکھا کہ تیرے حاکم نے خدا کے ایک فقیر کو اس طرح مارا ہے کہ اس واقعہ کو دیکھ کر عرش بھی لرز گیا ہے۔ اگر تو اُسے سزا دے، تو بہتر،

وگرنہ ہم دہلی کی سلطنت تجھ سے چھین کر کسی اور کو دے دیں گے۔

حضرت قلندر صاحب کا فرمان پڑھ کر سلطان علاء الدین کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اُس نے حکم دیا کہ حاکم کو فوراً پابہ زنجیر کر دیا جائے اور پھر حضرت قلندر صاحب سے معافی مانگنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ بالآخر بادشاہ کی طرف سے معافی طلب کرنے کا کام بھی حضرت امیر خسرو ہی کے سپرد ہوا کیونکہ سلطان یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قلندر صاحب کا غصہ سوائے حضرت امیر خسرو کے اور کوئی دور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انہیں بارگاہِ قلندری میں بھیجا گیا۔ آپ نے حضرت قلندر صاحب کے دربار میں حاضر ہو کر ایسا ساز بجایا کہ حضرت قلندر صاحب کا دل موم ہوگیا۔ اِس طرح حضرت امیر خسرو کے دل سے اُٹھے ہوئے نغموں کی بدولت سلطان کو معافی مل گئی۔

علامہ اقبالؒ نے بھی "اسرارِ خودی" میں اس واقعے کو نظم کیا ہے۔ ذیل میں متعلقہ اشعار درج کئے جاتے ہیں:

با تو می گویم حدیثِ بو علیؒ   در سوادِ ہند نامِ او جلی
آں نوا پیرای گلزارِ کہن   گفت با ما از گُلِ رعنا سخن
خطۂ این جنّتِ آتش نژاد   از ہوای دامنش مینو سواد
کوچک ابدالش سوی بازار رفت   از شرابِ بو علیؒ سرشار رفت
عاملِ آں شہر می آمد سوار   ہمرکاب او غلام و چوبدار
پیشرو زد بانگ ای نا ہوشمند   بر جلو دارانِ عامل رہ مبند

رفت آن درویش سر افگنده پیش — غوطه زن، اندر یمِ افکارِ خویش
چوبدار از جامِ استکبار مست — بر سرِ درویش چوبِ خود شکست
از رہِ عامل فقیر آزرده رفت — دلگران و ناخوش و افسرده رفت
در حضورِ بو علیؒ فریاد کرد — اشک از زندانِ چشمِ آزاد کرد
صورتِ برقے کہ بر کہسار ریخت — شیخ سیلِ آتش از گفتار ریخت
از رگِ جان آتشِ دیگر کشود — با دبیرِ خویش ارشادے نمود
خامہ را بر گیر و فرمانے نویس — از فقیرے سوئے سلطانے نویس
بندہ ام را عاملت بر سر زده است — بر متاعِ جانِ خود اخگر زده است
باز گیر این عاملِ بد گوہرے — ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے
نامۂ آن بندۂ حق دستگاه — لرزه ہا انداخت در اندامِ شاه
پیکرش سرمایۂ آلام گشت — زرد مثلِ آفتابِ شام گشت
بہرِ عامل حلقۂ زنجیر جُست — از قلندر عفوِ این تقصیر جُست
خسروِ شیرین زبان رنگین بیان — نغمہ ہااش از ضمیرِ کُن فکان
فطرتش روشن مثالِ ماہتاب — گشت از بہرِ سفارت انتخاب
چنگ را پیشِ قلندر چون نواخت — از نوائے شیشۂ جانش گداخت
شوکتے کو پختہ چون کہسار بود — قیمتِ یک نغمۂ گفتار بود

نیشتر بر قلبِ درویشان مزن

غیاث الدین تغلق

علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک کافور نے برائے نام چھوٹے شہزادے شہاب الدین کو تخت پر بٹھا دیا اور خود سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا، لیکن ایک ماہ بعد ہی اپنے خاص مقربوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ملک کافور کے قتل کے بعد سلطان علاء الدین کا تیسرا بیٹا قطب الدین مبارک برسرِاقتدار آیا۔ اُس نے شہاب الدین کو ہلاک کر کے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی کو بزرگوں اور مشائخ سے تعلق خاطر کم ہی تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے اسکی مخالفت تو مشہور ہے۔ حضرت بوعلی قلندر سے تعلقات کی نوعیت پردۂ اخفا میں ہے۔ البتہ سلسلہ سہروردیہ کے بزرگ حضرت شیخ ضیاء الدین رومیؒ سے اُس کی عقیدت کا ذکر تاریخ فیروز شاہی میں ملتا ہے۔ شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی شیخ ضیاء الدین رومیؒ صاحب کا خلیفہ بھی تھا۔

مبارک خلجی کے زمانے میں خسرو خاں نومسلم کو سلطنت کے کاروبار میں پورا پورا دخل حاصل تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں ہوسِ اقتدار نے جنم لیا۔ چنانچہ اس نے ۷۲۰ھ میں بادشاہ کو قتل کرا دیا اور سلطان ناصر الدین کے نام سے تخت نشین ہوا۔ فخر الدین جونا (جو بعد میں سلطان محمد تغلق کے لقب سے بادشاہ بنا) اس وقت

دہلی میں موجود تھا۔ وہ ایک رات چپکے سے سرسوتی پہنچ گیا، جہاں اس کے باپ غازی ملک کا ایک فوجی دستہ موجود تھا۔ غازی ملک کو اطلاع ملی، تو وہ دیپالپور سے روانہ ہوا۔ لہراوت کے مقام پر اس نے خسرو کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ کیونکہ اب خلجی خاندان کا کوئی شخص تختِ دہلی کا وارث نہ رہا تھا، اس لئے امراء نے غازی ملک کو متفقہ طور پر اپنا بادشاہ بنا لیا۔ غازی ملک ۷۲۰ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق عوام کا بہی خواہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی رعایا کو خوشحال دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک حق شناس اور وفاشعار بادشاہ تھا۔ تختِ دہلی پر اس جیسا بادشاہ کبھی نہیں بیٹھا اور شائد اس کے بعد بھی کوئی بادشاہ اس کی مثال پیش نہ کر سکے۔ وہ خاص موقعوں پر علماء و اساتذہ اور مفتیوں کو انعام دیا کرتا تھا۔ ہر خانقاہ پر مشائخ کرام اور گوشہ نشین بزرگوں کے لئے نذرانے اور تحائف بھیجا کرتا تھا۔ سراج عفیف کا بیان ہے کہ بادشاہ بننے سے پہلے ملتان اور دیپالپور کے قیام کے زمانے میں اس نے کئی بزرگوں سے خوشگوار تعلقات قائم کئے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے بیٹے جونا اور بھتیجے فیروز کو ساتھ لے کر شیخ علاءالدین پاکپتنی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واپسی پر شیخ صاحب نے فرمایا کہ یہ تینوں صاحب تخت و تاج ہوں گے۔ اسی طرح ایک مرتبہ وہ حضرت بوعلی قلندر کی خدمت میں بھی ان دونوں کے ہمراہ حاضر ہوا۔ قلندر صاحب نے ان کے سامنے کھانا رکھا۔ تینوں نے ایک ہی پیالے میں کھانا شروع کیا۔ قلندر صاحب نے انہیں اکٹھے کھانا کھاتے

دیکھ کر فرمایا کہ تین بادشاہ ایک ہی پیالے میں کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ یہ تینوں یکے بعد دیگرے بادشاہی تک پہنچے۔ غیاث الدین بادشاہ بننے کے بعد بھی عبادت و ریاضت میں پوری دلچسپی لیتا رہا اور احکامِ دین کی بجا آوری باقاعدگی سے کرتا رہا۔ بزرگوں اور اہلِ علم حضرات کی خدمت اس کا شعار رہا۔ البتہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ (جو اس عہد کے مشائخ کے سرخیل تھے) تغلق کی ٹھن آئی۔ یہاں تک کہ ۷۲۵ھ میں وہ ان تمام اختلافات کو لے کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔

ناصر الدین محمد تغلق

غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جوناخاں ناصر الدین محمد تغلق کے نام سے بادشاہ بنا۔ حضرت بوعلی قلندرؒ اس کی تخت نشینی سے قبل ۷۲۴ھ میں وفات پا چکے۔ اس کے باوجود تحفۃ الکرام اور ہفت اقلیم جیسے تذکروں میں حسبِ ذیل واقعہ درج ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ناصر الدین محمد تغلق نے حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

گہ راست کند صورتِ مردی و زنی
گہ بشکند این طلسمِ جانی و تنی
کس نیست کہ استادِ قضا را پرسد
کز بہرِ چہ سازی و چرا می شکنی

دکھی تو مرد اور عورت کی صورت گری کرتا، کبھی جان و تن یعنی روح اور جسم کے طلسم کو توڑ دیتا ہے۔ ایسا کوئی نہیں، جو استاد قضا سے یہ سوال کرے کہ تو کس لئے پہلے بناتا ہے اور پھر کیوں اپنے ہی بنائے ہوئے جسموں کو توڑ دیتا ہے؟)

حضرت بو علی قلندر نے جواب میں یہ رباعی ارسال فرمائی:

شرم است کہ در امر خدا دم زنی
این نوعے کہ گفتی، نہ تو مردی نہ زنی
گل را چہ مجال است کہ پرسد ز کلال
کز بہر چہ سازی و چرا می شکنی

(تجھے چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ کے احکام کے آگے چون و چرا نہ کرے۔ تو نے جس قسم کا اعتراض کیا ہے، اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تو نہ مرد ہے نہ عورت۔ مٹی کی کیا مجال ہے کہ وہ کمہار سے یہ سوال کرے کہ تم کس لئے بناتے ہو اور کیوں توڑ دیتے ہو۔)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ناصر الدین محمد تغلق کے بادشاہ بننے سے پہلے کا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس کا نام جونا خاں کی بجائے محمد تغلق لکھ دیا۔ ایسی فروگزاشت خارج از امکان نہیں ہوتی کیونکہ مشاہیر و سلاطین کے حالات میں ایسا معاملہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ لیکن اس سے اگلی بات بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ مذکورہ بالا سوال و جواب کے ایک سال بعد سلطان ناصر الدین تغلق حضرت قلندر صاحب کی

خدمت میں حاضر ہوا، اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ قلندر صاحب نے اُسے دیکھ کر فرمایا :

"اے بادشاہ، کتنے دن یہاں رہو گے؟"

بادشاہ نے عرض کی : "تین دن"

قلندر صاحب نے مسکرا کر کہا : "چار سال"

بادشاہ کو احساس ہوا کہ قلندر صاحب نے یہ اشارہ میری باقی عمر سے متعلق فرمایا ہے۔ اُس نے اِس احساس کے پیشِ نظر غریبوں اور مسکینوں میں بیشمار دولت تقسیم کر دی، لیکن ہوا وہی جس کا اُسے خدشہ تھا یعنی اس بات کے پورے چار سال بعد سلطان راہیِ عدم ہوا۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سلطان غیاث الدین تغلق کے ساتھ پیش آیا۔ کیونکہ اس کے بعد تو اس واقعہ کا ظہور میں آنا لایعنی سی بات ہو گی۔ غیاث الدین تغلق کی وفات ۷۲۵ھ میں ہوئی، اس سے ایک سال پہلے خود قلندر صاحب کا وصال ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اس بات کے پہلے حصّے کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ ناصر الدین محمد تغلق کی شہزادگی کے دِنوں میں یہ واقعہ رونما ہوا ہو اور اگر یہ مکمل واقعہ ایک ہی بادشاہ سے پیش آیا ہے، تو وہ بادشاہ غیاث الدین تغلق ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت قلندر صاحب کی وفات اِسی تغلق بادشاہ کے عہد میں واقع ہوئی، لیکن غیاث الدین تغلق کی شعر گوئی سے متعلق ہمیں کوئی ایسی روایت یا شہادت نہیں ملتی

کہ جس کی رو سے ہم اس واقعہ کے ابتدائی حصے کو اس بادشاہ سے منسلک کر سکیں۔ البتہ مذکورہ رباعی کے علاوہ کچھ اور اشعار بھی ناصرالدین محمد تغلق سے منسوب ملتے ہیں۔ مثلاً محمد قاسم فرشتہ نے حسبِ ذیل شعر محمد تغلق سے منسوب کئے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے یہ شعر عالمِ نزع میں کہے :

بسیار درین جہان چمیدیم   بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم   ترکانِ گرانِ بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر
چون قامتِ ماہِ نو خمیدیم

علاوہ برایں فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق فارسی میں بہت اچھے شعر کہتا تھا۔ پھر سلطان کی برجستگی اور حاضر دماغی و حاضر جوابی کے بعض واقعات بھی تاریخوں میں درج ہیں۔

ان امور کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس واقعہ کے کسی حصے میں کچھ صداقت ہے، تو وہ اس کا پہلا حصہ ہے اور اس کا تعلق صرف اور صرف محمد تغلق کی تخت نشینی سے قبل کی زندگی ہی سے ہو سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ واقعہ ہی محلِّ نظر ٹھہرتا ہے۔

ہمعصر مشاہیر

حضرت بو علی قلندر کا زمانہ بڑا مردم خیز زمانہ تھا۔ آپ کے معاصرین میں بہت سے اولیائے کرام اور مشائخِ کبار کے علاوہ بیشمار ادیبوں، شاعروں اور عالموں کا نام آتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نابغۂ روزگار اور صاحبِ نام و مقام تھا۔ ہم نے محدود صفحات کے پیشِ نظر ان میں سے چند مشاہیر کے ذکر پر ہی اکتفا کی ہے۔ البتہ اس بات کا حتی الامکان خیال رکھا ہے کہ ان حضرات کا ذکر ضرور کر دیا جائے، جن کا نام کسی نہ کسی ضمن میں قلندر صاحب کے حالات میں آیا ہے۔

قلندر صاحب کی صُلبی اولاد نہ تھی کیونکہ انہوں نے شادی نہیں کی اور تمام عمر تجرّد میں گزار دی تھی۔ البتہ ان کی روحانی اولاد یعنی مرید و عقیدت مند لاتعداد تھے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان کے برگزیدہ خلفاء اور مریدین کے حالات بھی الگ باب میں نہیں دیئے جا سکے کیونکہ ان میں سے کچھ حضرات تو ایسے ہیں کہ جن سے متعلق ضروری کوائف تاریخوں اور تذکروں سے نہ مل سکے۔ مثلاً ملک علی انصاری، مولانا سراج الدین رکوعی، مخدوم راجی جمشید اور شاہ اختیار الدین وغیرہ ـــــ اور کچھ نام ایسے بھی ہیں کہ جن کی مریدی کی نسبت مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف مشائخ سے بتائی ہے۔ لہٰذا ان کو کسی ٹھوس شہادت کے بغیر خاص زمروں میں تقسیم کرنا سراسر نامناسب تھا۔

اِن امور کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، قلندر صاحب کے برگزیدہ معاصرین کا ذکر بغیر کسی زمرہ بندی کے آئندہ صفحات میں کر دیا گیا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

آپ سادات خاندان کے عظیم فرزند تھے۔ آپ کے والدِ ماجد کا اسم گرامی سید احمد بخاری اور والدۂ محترمہ کا نام بی بی زلیخا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء، ۲۷ صفر المظفر ۶۳۴ھ (۱۲۳۶ء) کو آخری چہار شنبہ کے دن بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام "محمد" رکھا گیا۔ بڑے ہوئے تو چشتیہ سلسلے کے چوتھے پیشوا ہوئے اور آج نظام الدین اولیاء، نظام المشائخ اور محبوبِ الٰہی جیسے القابات سے مشہور ہیں۔

پانچ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس لئے ابتدائی زندگی بڑی تنگدستی میں گزری۔ اس فقر و فاقہ کے باوجود آپ نے پڑھنے لکھنے کا کام بڑی دلجمعی اور دلچسپی سے کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا شمس الملک، مولانا کمال الدین، قاری مولانا شادی نقری اور مولانا شمس الدین خوارزمی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سولہ برس کی عمر میں آپ ترکِ وطن کر کے اپنی والدہ کے ہمراہ دہلی چلے آئے، یہاں آپ کی ملاقات بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل سے ہوئی۔ شیخ صاحب کی بدولت ہی آپ کو بابا صاحب سے ارادت و عقیدت کا غائبانہ تعلق ہوا۔ انہی ایّام میں آپ کی والدۂ محترمہ کے وصال کا سانحہ پیش آیا۔

والدہ کی وفات کے بعد آپ زیادہ تر شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس ہی اپنا وقت گزارتے اور ان کی مجالسِ تصوّف و معرفت اور علم و عرفان سے کسبِ فیض کرتے۔ ان صحبتوں کے زیرِ اثر بابا صاحب کی ملاقات کا شوق بدر ... اتم بڑھا۔ ایک رات شہر کی جامع مسجد میں بسر کی علی الصبح مؤذن نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ

(یعنی، کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کی یاد کے وقت عاجزی اختیار کریں۔) الحدید، آیت ۱۶

اس آیت نے آپ پر تازیانے کا کام کیا۔ اُسی وقت اجودھن شریف کے لئے رختِ سفر باندھا۔ شیخ نجیب الدین متوکل بھی آپ کے ہمراہ ہو لئے۔ ۱۵ رجب المرجب ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) کو آپ بابا صاحب کی خدمت میں پہنچے اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ بابا صاحب آپ سے بڑی محبت فرماتے تھے اور آپ کی روحانی تربیت خاص انداز سے فرماتے تھے۔ آپ کے اندر بھی نورِ مرشد کے جذب کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے ہی سال ۲ ربیع الاوّل ۶۵۶ھ کو حضرت بابا صاحب نے آپ کو خلافتِ عظمیٰ عطا فرمائی اور پھر فرمایا کہ اے نظام الدین، ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت سپرد کی اور اس ملک کو تمہاری پناہ میں چھوڑا۔ اس کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے ملنے والی دستار آپ کے سر پر رکھ دی خرقۂ خاص

اپنے دستِ مبارک سے پہنایا اور لکڑی کی کھڑائیں اور عصا بھی عنایت فرمایا۔ آخر میں آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگی۔ اس کے بعد رخصت عنایت فرمائی۔

دہلی واپس آکر پہلے آپ ایک ماہ تک سعید کاغذی کے مہمان ہوئے، پھر کچھ دن کے لئے شادی گلابی کی حویلی میں رہے۔ اس کے بعد شمس الدین رکابدار کی خواہش پر آپ کے ہاں چند برس قیام کیا۔ جب عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھا، تو غیاث پور میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی۔ یہیں ۹۱ برس کی عمر میں آپ کا وصال ہوا۔ یہ سانحہ ۱۷ ربیع الاوّل ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو رونما ہوا۔

خواجہ علاء الدین علی احمد صابر کلیریؒ

خواجہ صابر ۱۹ ربیع الاوّل ۵۹۲ھ (۱۳۲۶ء) کو پیدا ہوئے۔ آپ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے بھانجے تھے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی سید عبداللہ تھا۔ خواجہ صابر خورد سالی ہی میں یتیم ہو گئے۔ باپ کی وفات کے بعد آپ اپنے ماموں کے ہاں چلے آئے۔ حضرت بابا صاحب نے یتیم بھانجے کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بھی ان دنوں مرشد کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی اور حضرت صابر کلیری نے ایک ہی زمانے میں حضرت بابا صاحب کے انوار سے کسب فیض کیا۔ حضرت خواجہ صابر کی شادی بھی بابا صاحب کی دختر نیک اختر حضرت خدیجہ بیگم سے ہوئی۔

خواجہ صابر کی روحانی تربیت ہو چکی، تو حضرت بابا صاحب نے آپ کو سلسلۂ چشتیہ کی خلافت عطا کی۔ ۶۵۲ھ میں آپ نے کلیر شریف میں ورود فرمایا اور رشد و ہدایت اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ مسلسل تیس برس تک اس خطّے کو اپنے روحانی چشمۂ فیض سے سیراب کرنے کے بعد خواجہ صابر کلیریؒ نے ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) میں وصال فرمایا۔ آپ کا عرس ہر سال گیارہ ربیع الاوّل کو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور اکنافِ عالم سے آپ کے عقیدت مند جمع ہوتے ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ

مولانا ۶۰۴ھ (۱۲۰۷ء) میں پیدا ہوئے۔ خاندانی اعتبار سے آپ عرب تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد ترکِ سکونت کر کے بلخ چلے آئے۔ یہیں مولانا کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والدِ محترم محمد بن حسین خطیبی تھے، جو بہاء الدین ولد کے نام سے مشہور تھے۔ سلطان علاء الدین محمد حاکمِ خوارزم کو حضرت بہاء الدین ولد سے بیحد عقیدت و ارادت کا تعلق تھا۔ مولانا بہاء الدین ولد نے ۶۱۷ھ (۱۲۲۰ء) میں بلخ سے رختِ سفر باندھا۔ آپ نیشاپور سے ہوتے ہوئے ملاطیہ (ترکی) میں وارد ہوئے۔ اس وقت مولانا جلال الدین رومی کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ ملاطیہ میں چار سال قیام کرنے کے بعد لارندہ میں رہائش اختیار کی۔ مولانا روم کی شادی اسی شہر میں ہوئی اور دو بچے بھی متولد ہوئے۔ سات سال کے بعد اس خاندان نے یہاں سے بھی کوچ کیا اور قونیہ

میں سکونت اختیار کرلی ۔ ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) میں مولانا کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کی وفات کے بعد آپ نے سید برہان الدین محقق ترمذی کے درس میں شمولیت اختیار کی۔ سید محقق ترمذی مولانا بہاءالدین ولد کے شاگردوں میں سے تھے، جو ان کے پاس بلخ میں پڑھا کرتے تھے۔ مولانا روم نے انہیں سے تصوف کی تعلیم پائی اور منازلِ سلوک بھی انہی کی تربیت میں طے کیں۔ سید برہان الدین محقق کی وفات کے بعد آپ صدرِ مدرسہ بنے اور درس و تدریس کے فرائض سنبھالے۔

انہی ایام میں حضرت شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی، جو اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے، بلخ میں تشریف لائے۔ مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کی شخصیت بڑی جذاب تھی۔ مولانا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی مریدی اختیار کرلی اور انہیں اپنے گھر لے گئے۔

حضرت شمس تبریزی سے مولانا روم کی یہ ملاقات اُن کی زندگی میں نقطۂ انقلاب ثابت ہوئی۔ آپ نے درس و تدریس میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور اب جذب و مستی کا غلبہ ہُوا۔ عوام نے مولانا میں یہ تبدیلی دیکھی، تو وہ حضرت شمس تبریزی کے پیچھے پڑھ گئے۔ انہوں نے اہلِ قونیہ کو اپنے خلاف دیکھا، تو خاموشی سے چلے گئے، لیکن مولانا نے اپنے بیٹے سلطان ولد کو ان کے پیچھے بھیجا، جو حضرت شمس تبریزی کو دمشق سے واپس لے آئے۔ کچھ عرصہ بعد وہی مخالفت پھر اُبھری۔ شمس تبریزی نے پھر قونیہ کو چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد پھر کسی نے آپ کو نہیں دیکھا۔ بعض

تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ مولانا کے مریدوں میں سے کسی نے شمس تبریزی کو قتل کر دیا۔ بعض یہ الزام مولانا کے بیٹے سلطان ولد پر لگاتے ہیں۔

حضرت شمس تبریزی کے فراق میں مولانا کے جذب وجنوں اور سوز وگداز میں اور اضافہ ہوا۔ اسی حالت میں انہوں نے ایک ضخیم دیوان اپنے پیر کے نام سے لکھا، جو دیوان شمس تبریزی اور کلیاتِ شمس تبریزی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد مولانا کو صلاح الدین زرکوب کی صحبت میسر آئی۔ جس میں انہیں سکونِ قلب حاصل ہوا۔ صلاح الدین زرکوب آپ کے خلیفہ بنے، لیکن مولانا کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ خود مولانا نے بھی ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) میں انتقال فرمایا۔ ان کی وفات کے بعد حسام الدین خلیفہ مقرر ہوئے۔ مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی انہی کے کہنے پر لکھی تھی۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ

آپ کا اصل نام عثمان بن ابراہیم کبیر تھا۔ مرند (مروند) کے رہنے والے تھے۔ یہ شہر ایران کے مشہور شہر تبریز سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔

آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ آپ ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے سندھ میں تشریف لانے کی صحیح تاریخ بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ بہرصورت یہاں آکر انہوں نے سیہون شریف میں قیام فرمایا،

کچھ عرصہ بعد ۶۶۲ھ (۱۲۶۳ء) میں ملتان کا سفر کیا۔ یہاں شہزادہ شہید محمد قاآن بن سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں ایک دن محفلِ سماع میں شمولیت کی۔ آپ کے ہمراہ شیخ صدرالدین بن حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی بھی تھے۔ اس محفل میں دونوں شیوخ یعنی حضرت شیخ عثمان مروندی اور حضرت شیخ صدرالدین پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور ضیاءالدین برنی کے بقول دونوں رقص کرنے لگے۔

حضرت عثمان مروندی نے حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی، شیخ جلال الدین سرخپوش اور حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی صحبتوں میں بھی شرکت کی۔ مفتی غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں کہ آپ سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں سے ارادت رکھتے تھے۔

آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی اور تجرد کی زندگی اختیار کی۔ آپ کا سالِ وفات ۶۷۳ھ (۱۲۷۴ء) ہے۔

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ

آپ سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا خاندان ماوراءالنہر کے علاقے میں آباد تھا۔ یہیں آپ کی ولادت ہوئی۔ ظاہری اور باطنی علوم اپنے وطن کے علماء سے حاصل کئے پھر حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت بابا صاحب نے آپ کو حضرت خواجہ صابر کلیری کی خدمت میں بھیجا، اور ہدایت کی کہ خواجۂ کلیر سے کسبِ فیض کریں۔ چنانچہ آپ گیارہ سال تک خواجہ صابر کی

خدمت گزاری میں مصروف رہے۔ مرشد سے اجازت ملی، تو سلطان غیاث الدین بلبن کے فوجی سواروں میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور شب و روز ذکرِ الٰہی میں مصروف رہنے لگے۔

مرشد کے حکم سے پانی پت تشریف لے گئے۔ اُس وقت قلندر صاحب بھی پانی پت میں تشریف فرما تھے۔ کہتے ہیں کہ قلندر صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع بذریعہ کشف ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت جلال الدین کبیر الاو ؒ کو آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے بھیجا

آپ کی وفات ۷۱۵ھ میں ہوئی۔ مزارِ مبارک پانی پت میں ہے۔

حضرت شیخ کبیر الاولیاءؒ

والدین نے آپ کا نام محمد رکھا، لیکن آپ کے مرشد حضرت شمس الدین ترک نے آپ کو جلال الدین اکبر کے نام سے یاد کیا۔ بعد میں آپ کبیر الاولیاء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امیر المؤمنین حضرت عثمانِ غنیؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کا مولد پانی پت شریف ہے۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ حضرت بو علی قلندر آپ پر بیحد شفقت فرمایا کرتے تھے۔ انہیں بھی قلندر صاحب سے بہت محبت تھی۔ آپ کی تربیت میں قلندر صاحب کا خاص حصّہ ہے۔ قلندر صاحب کی خواہش کے مطابق آپ نے حضرت خواجہ شمس الدین ترک کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر سندِ خلافت عطا ہوئی۔

مولانا سید محمد میاں صاحب نے آپ کی ولادت کا سال ۶۲۵ھ قرار دیا ہے۔

"مفتاح الغیب" نے تاریخ وفات ۱۳ ربیع الاوّل ۶۵۰ھ بیان کی ہے۔

شیخ فخر الدین عراقیؒ

شیخ عراقی ۶۰۶ھ (۱۲۰۹ء - ۱۰) میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر بدخشانی نے آپ کے والد کا نام ابراہیم لکھا ہے۔ ان کے برعکس بہت سے دوسرے تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ خود شیخ کا پورا نام شیخ فخر الدین ابراہیم تھا، لیکن انھوں نے والد کا نام نہیں لکھا۔

شیخ فخر الدین عراقی ہمدان کے نواح کے رہنے والے تھے۔ بچپن کا زمانہ اپنے وطن میں گزارا۔ خورد سالی ہی میں کلام پاک حفظ کیا اور ظاہری علوم کو بھی تکمیل تک پہنچایا۔ سترہ برس کی عمر میں قلندروں کی ایک جماعت کے ساتھ ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور یہاں آکر ملتان کو اپنا مسکن بنایا۔

ملتان میں ان دنوں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی بارگاہ مرجعِ خلائق تھی۔ عراقی بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ آپ نے پیر کی صحبت میں رہ کر کڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے اور راہِ سلوک ان کی راہنمائی میں طے کی۔ ایک مرتبہ آپ نے جذب و مستی کے عالم میں حسب ذیل مطلع کی غزل کہی:

نخستین بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مستِ ساقی وام کردند

حضرت بہاء الدین زکریا نے یہ غزل سن کر فرمایا:

"کارِ او تمام شد" ـــــ اور پھر عراقی کو گلے لگا لیا۔ اس کے بعد خرقۂ خلافت پہنایا۔

شیخ فخرالدین عراقی کی شادی بھی حضرت بہاء الدین زکریا کی صاحبزادی سے انجام پائی۔

مرشد کے وصال کے بعد عراقی فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے چلے گئے۔ وہاں سے ایشیائے کوچک کا سفر کیا اور مولانا صدرالدین کے درس میں شامل ہوئے۔ شیخ نے مولانا سے "فصوص الحکم" کا درس لیا۔ اسی دوران میں "لمعات" بھی تصنیف کی۔ قونیہ میں معین الدین پروانہ کی وفات تک قیام کیا۔ اس کے بعد مصر اور پھر شام چلے گئے۔ آپ کا بیٹا کبیرالدین بھی آپ سے ملنے شام چلا آیا۔

شیخ عراقی نے دمشق کے مقام پر ۶۸۸ھ (۱۲۸۹ء) میں وفات پائی اور شیخ محی الدین ابن العربی کے مقبرے کے برابر میں مدفون ہوئے۔

حضرت امیر خسرو دہلویؒ

آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے محبوب ترین مرید تھے۔ صوفیاء اور مشائخ کرام میں حضرت امیر کی مرشد سے عقیدت و ارادت اور حضرت خواجہ کی اپنے مرید سے محبت اور شفقت کا سلوک ضرب المثل ہو گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ حضرت امیر خسرو اپنے

مُرشد کی نظروں ہی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے بلکہ وہ خواص و عوام میں بھی بڑے ہر دِلعزیز تھے۔

حضرت امیر خسرو ۶۵۱ھ (۱۲۵۲ء) میں پٹیالی ضلع ایٹہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا نام ابوالحسن، لقب یمین الدین اور تخلص خسرو تھا۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود ترکی النسل تھے اور والدہ ہندی الاصل تھیں۔ آپ آٹھ برس کے ہوئے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کے نانا عماد الملک نے آپ کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ بیس برس کے ہوئے تو نانا بھی داغِ مفارقت دے گئے۔

نانا کی وفات کے بعد آپ نے غیاث الدین بلبن کے بھتیجے چھجو کی ملازمت اختیار کر لی، لیکن جلد ہی اُس کی ناراضگی کے سبب سامانہ میں شہزادہ بغرا خاں کے درباری شاعر بن گئے۔ ۶۷۰ھ سے ۶۸۳ ہجری تک شہزادے محمد قاآن کے ساتھ ملتان میں بطورِ مصحف دار منسلک رہے۔ یہاں خواجہ حسن سجزی (جن کا ذکر آگے آئے گا) بھی آپ کے ہمراہ مقیم تھے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں شہزادے کی شہادت کے بعد آپ کچھ دنوں تک امیر علی سرجاندار کے پاس اودھ میں رہے۔ اودھ سے واپس ہوئے تو کیقباد بادشاہ سے ملک الشعراء کا عہدہ حاصل کیا۔ یہ عہدہ سلطان محمد تغلق کے عہد یعنی آپ کی وفات تک آپ ہی کے پاس رہا۔ سلطان جلال الدین فیروز خلجی آپ پر نسبتہً زیادہ مہربان تھا، اس لئے اس نے آپ کو "امیر" کا خطاب بھی دیا۔

حضرت امیر خسرو گوناگوں خوبیوں اور ایک پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ آن

کے ہاں دل اور دماغ کی بے شمار اور غیر معمولی صلاحیتیں بیک وقت جمع تھیں۔ آپ ایک برگزیدہ عارف، عالی مرتبہ صوفی، عربی و فارسی اور ہندوی و پنجابی کے عظیم شاعر اور ادیب، بے مثل موسیقی دان اور بہت بڑے طباع و مخترع انسان تھے۔ آپ نے متضاد قسم کے ماحول کے ساتھ بلا کی ذہانت اور تدبر سے نبھا کیا۔ دربارِ شاہی اور خانقاہِ نظامی میں آپ کو متوازی طور پر قدر و منزلت حاصل تھی۔ یہاں تک ممکن ہو سکا آپ نے دربار اور خانقاہ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی اور ایک خوشگوار ماحول اور پُرامن فضا پیدا کرنے کی پوری پوری سعی کی۔ حضرت امیر میں اسی قسم کی بے شمار اور بھی ظاہری و باطنی خوبیاں تھیں۔

انہوں نے اپنے ان جمیع کمالات کی بدولت ہی حضرت محبوبِ الٰہی کے دل کو جیت لیا تھا، اور آپ کے فیوض و برکات سے خاص حصّہ پایا تھا۔ حضرت خواجہ نے آپ کو "ترک اللہ" کے خطاب سے نوازا تھا، اس کے علاوہ اپنے اشعار میں حضرت امیر کی بیحد تعریف بھی کی ہے، مثلاً آپ کی یہ رباعی مشہور ہے:

خسرو کہ با نظم و نثر مثلش کم خاست
این خسروِ ماست، ناصرِ خسرو نیست
ملکیتِ ملکِ سخن آں خسرو راست
زیرا کہ خدای ناصرِ خسروِ ماست

اور پھر یہاں تک کہہ دیا:

گر برای ترکِ ترکم، ارّہ بر تارک نہند
ترکِ تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترکِ ترک

حضرت محبوبِ الٰہی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے وجود سے رنجیدہ ہو جاتا ہوں مگر اے ترکِ من، میں تجھ سے کبھی رنجیدہ نہیں ہوتا ــــ میں اور سب سے اُکتا جاتا ہوں، لیکن خسرو سے کبھی نہیں اُکتاتا ــــ جب قیامت کے دن سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے، تو میں جواب میں خسرو کو پیش کر دوں گا ــــ حشر کے دن امید ہے کہ مجھے اس ترک بچے کے سوزِ سینہ کی بدولت بخش دیا جائے گا اور آپ دعا کیا کرتے تھے کہ اے خدا، اس ترک کے سوزِ سینہ کی بدولت مجھے بخش دے۔

محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ آپ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی قبر میں خسرو کو دفن کرنے کی وصیت کر جاتا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کیا جائے۔ حضرت امیر کے رتبے کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ مریدوں میں سے جس کسی کو حضرت محبوبِ الٰہی کی خدمت میں کوئی گزارش کرنی ہوتی تو ہمیشہ حضرت کے وسیلے ہی سے ہوا کرتی تھی۔ آج بھی عقیدت مند حضرت محبوبِ الٰہی کے مزار پر حاضری سے پہلے حضرت امیر کے مزار پر حاضری کو ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو بھی صحیح معنوں میں فنافی الشیخ تھے۔ آپ نے اپنی نظم و نثر کی کتابوں میں حضرت محبوبِ الٰہی کو جی بھر کے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، جن

کے اقتباسات طوالت کے خوف سے یہاں درج نہیں کئے جاتے۔

حضرت خواجہ کا جب وصال ہوا تو حضرت امیر غیاث الدین تغلق کے ہمراہ بنگال کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ مرشد کی وفات کی خبر سنی تو دیوانہ وار واپس دہلی پہنچے، اور خانقاہِ نظامی پر پہنچتے ہی یہ شعر پڑھا:

این مکانیست کہ منزلگہِ جانان بودہ است
راہِ آمد شدِ آن سرو خرامان بودہ است

آپ کے مزار پر آئے تو بے اختیار منہ سے نکلا: "سبحان اللہ! آفتاب زیر زمین و خسرو زندہ"۔ اس کے بعد یہ دوہا پڑھا اور شدتِ غم سے بیہوش ہو کر گر پڑے:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی سب دیس

اس طرح مرشد کی جدائی میں خسرو نے صرف چھ کا عرصہ بمشکل گزارا۔ بالآخر ۱۸ شوال ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو حضرت امیر بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ آپ کا مزار حضرت خواجہ کی پائینتی میں ہے اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

شیخ شرف الدین احمد منیریؒ

۶۶۱ھ (۱۲۶۳ء) میں بمقام منیر ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا اسمِ گرامی یحییٰ منیری تھا۔ آپ نے سنار گاؤں کے مشہور عالم مولانا شرف الدین

ابو توامہ سے علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد خواجہ نجیب الدین کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ سلسلۂ فردوسیہ کے سب سے مشہور بزرگ ہوئے ہیں علم و فضل میں یکتا تھے۔

آپ کے مکتوبات خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں، جن میں آدابِ طریقت اور اسرارِ حقیقت کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ معدن المعانی، خوانِ پُر نعمت، راحت القلوب، ارشاد السالکین اور ارشاد الطالبین وغیرہ بھی آپ کی تصانیف سے ہیں۔ آپ نے ۷۸۲ھ (۱۳۸۰ء) میں رحلت فرمائی۔ مزارِ مبارک بہار میں ہے۔

مولانا شمس الدین یحییٰ رح

اپنے زمانے کے بے مثل اور جیّد عالم تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہ اپنے ایک عربی قصیدے میں آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

سالت العلم من احیاک حقا
فقال العلم شمس الدین یحییٰ

مولانا شمس الدین یحییٰ حضرت نظام الدین اولیاء کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے اپنے "تذکرۂ علمائے ہند" میں آپ کو صفِ اوّل کے علماء میں شمار کیا ہے۔

آپ لوگوں کی بیعت لینے اور انہیں مرید کرنے میں اکثر گریز سے کام لیا کرتے

تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر خلافت نامہ پر حضرت شیخ کے دستخط نہ ہوتے تو اسے اپنے پاس نہ رکھتا۔ کہتے ہیں کہ محمد تغلق نے آپ کو زبردستی کشمیر بھیجنا چاہا۔ اتفاق سے روانہ ہوتے وقت ان کے سینے پر پھوڑا نکل آیا جو ان کی رحلت کا موجب بن گیا۔

مولانا شمس الدین یحییٰ نے سلسلۂ چشتیہ کو علمی وقار عطا کیا۔ آپ نے "مشارق الانوار" کی ایک شرح بھی لکھی، جو حوادثِ زمانہ کا شکار بن گئی اور آجکل مفقود الوجود ہے۔

شیخ نصیر الدین روشن چراغ دہلیؒ

آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد نظامی سلسلے کے سربراہ مقرر ہوئے۔ آپ بڑے مستقل مزاج اور بلند حوصلہ انسان تھے۔ جب آپ نے مرکزی نظام کی باگ ڈور سنبھالی تو حالات خانقاہی معاملات کے حق میں بالکل نہ تھے۔ انہیں حکومت نے مسلسل پریشان کئے رکھا۔ شیخ چراغ بہت سی خوبیوں میں حضرت نظام الدین اولیاء سے مشابہت رکھتے تھے۔ مصنف "سیر الاولیاء" نے لکھا ہے کہ شیخ نصیر الدین کی مجلس سے مجھے بالکل ویسی ہی خوشبو آئی جیسی کہ سلطان المشائخ کی مجلس سے آتی تھی۔

ایک بار آپ نے اپنے مرشد سے اس بات کی درخواست کی کہ انہیں تنہائی میں رہ کر عبادت و ریاضت کی اجازت فرمائی جائے۔ حضرت محبوب الٰہی نے انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں خلق میں رہنا چاہیئے اور لوگوں کے مصائب جھیلنے چاہئیں اور ان کے عوض بذل و ایثار اور بخشش سے کام لینا چاہیئے۔

شیخ چراغ دہلی نے مرشد کی اس نصیحت پر کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی عمل کیا اور اپنے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آنے دی۔

آپ کے ملفوظات کے مجموعے کا نام "خیر المجالس" ہے، جس کے پڑھنے سے قاری کے دل پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ایک ایک لفظ میں درد اور سوز نا کی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ہر بات دلوں میں گھر کئے بغیر نہیں رہتی۔

آپ فیض آباد میں شیخ یحیٰیؒ کے گھر پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ کو روحانیت سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ علم ظاہری آپ نے مولانا عبدالکریم شیرانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی سے حاصل کیا۔ چالیس برس کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور حضرت محبوب الٰہی کے مرید ہو گئے۔ علوم باطنی میں یہاں تک ترقی کی کہ خلافتِ عظمٰی کا اعزاز پایا، اور بتیس سال تک سلسلہ چشتیہ کی خدمت کی۔ آپ کی وفات ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) کو واقع ہوئی آپ کا مزارِ مبارک دہلی شہر سے سات میل کے فاصلے پر موضع "چراغ دہلی" میں ہے۔

حضرت خواجہ حسن سجزی دہلویؒ

خواجہ حسن چشتیہ سلسلہ کے بلند پایہ عالم تھے۔ دربارِ محبوبِ الٰہی میں انہیں بھی خاص مرتبہ

حاصل تھا۔ آپ ۶۵۲ ہجری میں بدایون کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا اسمِ گرامی نجم الدین حسن تھا اور حسن تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد صاحب کے نام کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی کے نزدیک ان کا نام "علاء الدین" تھا تو کسی نے "علا" لکھا ہے، لیکن زیادہ تر اتفاق اس پر ہے کہ خواجہ حسن کے والد "علی" تھے، جن کا تعلق دہلی کے ایک سید خاندان سے تھا۔ یہ خاندان غیاث الدین بلبن کے عہد تک دربارِ دہلی میں اثر و رسوخ کا مالک رہا ہے۔

خواجہ حسن حضرت امیر خسرو کے عزیز ترین دوست تھے۔ ملتان میں شہزادے محمد قاآن کے ہمراہ آپ بھی دوات دار کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے۔ خواجہ حسن کو شاعری میں بھی بلند مقام حاصل ہے۔ آپ کو "سعدیِ ہندوستان" بھی کہا گیا ہے۔ غزل میں آپ کو خاص دسترس تھی۔ آپ نے حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات کو "فوائد الفواد" کے نام سے ترتیب دیا۔ ملفوظات کی یہ کتاب اپنے مطالب کے اعتبار سے سلسلۂ چشتیہ کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔ امیر خسرو کہا کرتے تھے کہ کاش میری تمام تصنیفات حسن کے نام منسوب ہو جائیں اور صرف "فوائد الفواد" مجھ سے منسوب ہوتی۔ مولانا جامی علیہ الرحمہ آپ کے بڑے مداح تھے۔

سلطان محمد تغلق کے زمانے میں آپ کو بھی دہلی چھوڑ کر دولت آباد میں قیام کرنا پڑا۔ وہیں آپ نے ۷۳۸ھ (۳۸-۱۳۳۷ء) میں وفات پائی۔ سالِ وفات "مخدومِ اولیاء" سے نکلتا ہے۔ آپ کا مزار حضرت برہان الدین غریب کے روضے کے بالکل قریب ہے۔

قاضی ضیاء الدین سنامیؒ

قاضی صاحب حضرت قلندر صاحب کے معاصر علماء میں سے تھے۔ شریعت کی پابندی میں سخت گیر تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں چونکہ سماع کی محفل ہوا کرتی تھی، اس لئے ہمیشہ آپ کی مخالفت میں رہے۔ قاضی صاحب مرض الموت میں مبتلا ہوئے، تو حضرت نظام الدین اولیاء ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ قاضی صاحب نے سُنا، تو اپنی پگڑی راہ میں بچھادی۔ آپ نے ان کی پگڑی اُٹھا کر آنکھوں سے لگالی۔ جب آپ قاضی صاحب کے سامنے تشریف فرما ہوئے، تو انہوں نے ندامت کی وجہ سے آنکھیں سامنے نہ کیں۔ حضرت خواجہ صاؒ. قاضی صاؒ. کے گھر سے نکلے، تو اُن کے فوت ہو جانے کا شور اُٹھا۔ حضرت خواجہ کو قاضی صاحب کی وفات کا بیحد دکھ ہوا۔ آپ فرماتے تھے کہ افسوس! ایک ذات شریعت کی حامی تھی، سو وہ بھی نہ رہی۔

قاضی صاحب کا حضرت قلندر صاحب کی مونچھیں کترنے کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ آپ صاحب تصنیف بھی تھے۔ "نصاب الاحتساب" آپ کی اہم تالیف ہے، جس میں بدعت اور احکام سنّت کا بیان ہے۔

شہزادہ مبارک خاں

مبارک خاں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا تھا۔ "مفتاح" کا بیان ہے کہ

شہزادہ مبارک خاں کی پیدائش قلندر صاحب کی دعا ہی سے ہوئی تھی۔ شہزادہ جوان ہُوا تو آپ کا مرید و معتقد ہُوا۔ مرشد اور مرید میں محبت کا رشتہ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو کی محبت کی مثال بنا۔ شہزادے کی وفات کا سانحہ قلندر صاحب کی زندگی ہی میں رونما ہُوا۔

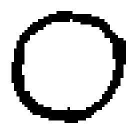
شہزادہ مبارک خاں کا مزار پانی پت شریف میں قلندر صاحب کے مزار کے پاس ہی ہے۔ آپ کے مزار مبارک پر حاضر ہونے والے عقیدت مند حضرات پہلے شہزادے مبارک خاں کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت قلندر صاحب نے اپنے مریدوں کو یہ حکم اپنی زندگی ہی میں دے دیا تھا کہ وہ پہلے شہزادے کی قبر پر حاضری دیں۔

مولانا ضیاء الدین برنی ؒ

مولانا برنی اپنی "تاریخ فیروز شاہی" کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرتِ دوام رکھتے ہیں۔ علماء و مشائخ کی صحبتوں میں شامل ہونے کا شوق بیش از پیش تھا۔ خود بھی بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کو بے شمار اقوال و حکایات از بر تھیں۔ مولانا بڑے ہنس مکھ اور ظریف طبع انسان تھے۔ اسی ظرافتِ طبعی کی بدولت سلطان محمد تغلق کی مصاحبت حاصل ہوئی۔ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء سے عقیدت کی بناء پر غیاث پور میں رہائش اختیار کی۔

ضیاء الدین برنی ۶۲۹ھ (۳۲-۱۲۳۱ء) میں پیدا ہوئے۔ برن ضلع بلند شہر

ان کا وطن تھا۔ ایک سو نو سال کی عمر پاکر ۷۳۸ھ (۳۸-۱۳۳۷ء) میں وفات پائی
اور حضرت محبوبِ الٰہی کے مقبرے میں اپنی والدہ کی پائینتی میں مدفون ہوئے۔



تعلیمات

(پند و نصائح پر مبنی یہ اقتباسات آپ کے مکتوبات سے لئے گئے ہیں، جو آپ نے اختیار الدین کو مخاطب کر کے لکھے تھے۔)

اے برادر! تجھے چاہیئے کہ شریعت سے لگاؤ رکھے اور تو شریعت کے مطابق زندگی بسر کرے کیونکہ شریعت دل کے آئینے کو صیقل کر دیتی ہے اور حسن و عشقِ حقیقی کے کرشمے دل میں دکھاتی ہے۔ شریعت دل کے لئے شمع کا کام دیتی ہے اور نفس کے شر کو دبا دیتی ہے۔ شریعت تجھ سے عشق پیدا کرتی ہے اور محبت کی کیفیت وارد کرتی ہے۔ یہ تجھے محبوب حقیقی کا جلوہ دکھاتی ہے۔ شریعت کے ذریعے ہی طریقت کا راستہ دکھائی دیتا ہے۔ شریعت درختِ طریقت کا تنہ ہے، اور اس کے پھل کی حقیقت بھی یہی ہے۔

اے برادر! شریعت کی پابندی کر۔ شریعت ہی تشنۂ عشقِ الٰہی ہے۔ جب تک تو محبت کے مکتب میں شریعت کا درس نہیں لے گا تشنۂ عشق کو کس طرح پہچانے گا تاکہ تو شریعت کی راہِ مستقیم پر قائم رہ سکے۔ تو جب تک شریعت کی راہ پر استقامت سے گامزن نہیں ہوگا، محبت کے صحیح انداز اور محبوبِ حقیقی کو پہچان نہیں سکے گا۔ طریقت کا پھول شریعت کے طفیل ہی کھلتا ہے۔

اے برادر! تیرا جسم شریعت ہے، تیرا دل طریقت اور تیری روح حقیقت ہے۔

اے برادر! عقلمند وہ ہوتا ہے، جو اپنے آپ کو پہچان لے اور اپنے نفس کی حقیقت کو جان لے اور اپنے آپ کو محبوبِ حقیقی کے حوالے کر دے اور اپنے آپ کو اس کے حُسن میں اس طرح گم کر دے کہ اپنی ہستی کا احساس ہی مٹ جائے۔ صاحب عقل وہ ہے جو توحید سمجھے اور شریعت و طریقت اور حقیقت کو عقل کے ذریعے معلوم کرے۔

اے برادر! اگر کسی کنوئیں میں چوہا گر جائے اور مر جائے، تو اس مُردہ چوہے کو کنوئیں سے باہر نکالنے کے بعد چند ڈول پانی کنوئیں سے نکالتے ہیں اس طرح کنوئیں کا پانی پاک ہو جاتا ہے اور ہرگز پلید نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر تو اپنے گناہوں سے توبہ کر لے اور دوبارہ اُن گناہوں کو نہ دہرائے۔ حلال کو حلال جانے اور حرام کو علی الاعلان حرام کہے اور اپنے مُردار نفس کو نکال باہر پھینک دے، تو یقیناً تجھے عبادت اور اتقاء میں فرحت حاصل ہو گی۔

اے برادر! یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ رزق اور موت کسی شخص کے ہاتھ میں نہیں۔ خدا نے تمہیں عشق سے پیدا کیا ہے، اس لئے تو خاطر جمع رکھ کہ یہ دونوں چیزیں یعنی رزق اور موت اُس کے دستِ قدرت میں ہیں اور کسی کو یہ مجال نہیں کہ ان میں کمی بیشی کر دے۔

اے برادر! جب تک تو عشق میں اپنے جگر کو خون نہیں دے گا، جب تک صاحبِ حُسنِ حقیقی کے دروازے پر تو خاک نہیں ہو جاتا اور اُس خاک میں تو درختِ حنا کا بیج نہیں بوتا اور اس درخت کے پتے پتے میں تو اپنا خون نہیں دیتا یعنی جب تک تو اس

درخت کی آبیاری اپنے خون سے نہیں کرے گا اور دو بھاری پتھروں کے درمیان اپنے آپ کو پِستا ہُوا نہیں دیکھے گا، اس وقت تک یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ تو صاحبِ حُسن کی نظر میں مقبول ہو سکے۔

اے برادر! اگر بھیڑوں کے گلّے میں بھیڑیا آجائے اور اُن میں سے ایک بھیڑ کو اٹھا لے جائے، تو دوسری بھیڑیں اس وقت تک نظریں اُٹھا اُٹھا کر دیکھتی رہتی ہیں جب تک کہ وہ بھیڑیا ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا۔۔۔ اور تو بے خبر ہے حالانکہ دوسروں کی موت کے واقعات تجھے خبردار کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ پھر بھی تو ہوشیار نہیں ہوتا اور غفلت ہی میں رہتا ہے۔

اے برادر! یہ دنیا دوستوں کے لئے قید خانے کی مانند ہے اور دشمنوں کے لئے بہشت ہے۔ اس دنیا میں دوستوں کو ستاتے ہیں اور دشمنوں پر بیشمار عنایات کی جاتی ہیں، لیکن آخرت میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ دشمنوں یعنی کافروں اور منافقوں کو دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا اور اس دنیا میں ظلم و ستم کا شکار ہونے والے دوستوں یعنی مؤمنوں کو جنّت کی نعمتوں سے مالا مال کیا جائے گا۔

اے برادر! جب تم پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی عنائت شروع ہو جائے، تم میں جذبہ پیدا ہونے لگے اور تمہیں تم سے دُور کیا جانے لگے، تو سمجھ لینا کہ گویا عشق کا آغاز اور حُسن کا جلوہ تم پر ظاہر ہو گیا اور جب تمہیں حُسن کا مشاہدہ حاصل ہو جائے، تو محبوب کو پہچاننے کی کوشش کرو اور پھر عاشق بن کر خود محبوب بن جاؤ۔ پھر جب محبوب بن جاؤ، تو

اسی طرح کے کام کرو۔ محبوب کی سنّت اور عاشق کے فریضے کو قائم رکھو۔ اس وقت تم محبوب کو عاشق کے ذریعے سے پہچان سکو گے ۔

اے برادر! محبوب کو تمہاری ہی شکل میں پیدا کر کے تمہارے درمیان بھیجا گیا ہے تاکہ وہ بلاواسطہ تمہیں دعوت دے ۔

اے برادر! خدائے عزّوجلّ نے جنّت اور جہنم کو بنایا اور پھر اُس کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ان دونوں کو بھر دیا جائے گا۔ محبوب کو عشّاق کے ہمراہ جنّت میں جگہ دی جائے گی اور شیطان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوزخ کو پُر کرے گا۔ دونوں کے وجود کی پیدائش عاشق ہی کے حُسن سے ہوئی ہے اور دونوں مقامات کسی دوسرے کیلئے نہ ہوں گے۔ بہشت دوستوں سے ملاقات کی جگہ ہے اور دوزخ دشمنوں کے لئے فراق کا مقام ہے۔ یہ فراق کافروں اور منافقوں کے لئے ہوگا۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عاشقوں اور دوستوں کو وصال کی نعمت ملے گی۔

اے برادر! چشمِ دل کو کھولو اور بڑے غور سے دیکھو اور یہ جان لو کہ عاشق نے اپنے عشق سے تمہارے لئے کیا کیا چیزیں پیدا کیں اور کیسے کیسے جلوے دکھائے۔ اس نے اپنے حُسن سے ایک درخت سجایا اور طرح طرح کے میوے پیدا کئے۔ ہر میوے میں ایک نیا ذائقہ بنایا۔ اس درخت کو نہ تو اپنی ذات ہی کی کچھ خبر ہے، نہ اپنے پھول کی اور نہ اپنے میوے کی۔ اس نے تمہارے لئے میٹھا گنا پیدا کیا، جس کو اپنی شیرینی کی خبر نہیں۔ صرف تمہاری خاطر ہرن کی ناف میں مشک کو رکھا، جس کی خود ہرن کو

خبر نہیں۔ سمندری گلٹے سے تمہارے لئے عنبر کو پیدا کیا، اور گلٹے اس عنبر سے بے خبر ہے۔ مشک بلاؤ سے تمہارے لئے خوشبو پیدا کی، جس کی خبر مشک بلاؤ کو خود نہیں۔ تمہارے لئے درخت سے کافور پیدا کیا، خود درخت کو اس کا پتہ نہیں۔ صندل کو تمہارے لئے پیدا کیا، لیکن خود صندل کو اپنی خبر نہیں۔

اے برادر! عاشق بن جاؤ اور دونوں جہان کو معشوقِ حقیقی کا حسن جانو اور اپنے آپ کو معشوق کا حسن سمجھو۔ عاشق نے اپنے عشق سے تیرے وجود کا ملک بنایا تاکہ وہ اپنے حسن و جمال کو تیرے آئینے میں دیکھے اور تمہیں اپنا محرم راز جانے اور اَلْاِنْسَانُ سِرِّی (یعنی انسان میرا بھید ہے) تمہاری ہی شان میں آیا ہے۔ پس عاشق بن جاؤ تاکہ ہمیشہ حسن کا دیدار کرو۔ دنیا اور آخرت کو پہچان لو۔ عقبیٰ کا مُلک محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مُلک ہے اور دنیا شیطان کی مِلک ہے۔ یہ معلوم کرو کہ دونوں میں سے تمہارے لئے کونسا بنایا ہے۔

اے برادر! نفس کو اچھی طرح پہچان لو، کیونکہ جب تم نفس کو اچھی پہچان لوگے، تو دنیا کو بھی پہچان لوگے۔ اسی طرح اگر تم روح کو پہچان لوگے، تو عقبیٰ کو بھی پہچان لوگے۔

اے برادر! جو حسن دنیا میں کفر کو بخشا ہے، عاشق جانتے ہیں کہ حسن نے کفر کو اپنے عاشقوں کے سامنے کس قدر آراستہ کیا ہے۔ جو شخص دنیا کا عاشق ہے، اس کا محبوب کفر کا حسن ہے۔ اے برادر! کیا تم جانتے ہو کہ حسن کا جو غمزہ کفر میں رکھا گیا ہے،

اُس نے دنیا والوں پر کیسا پُر لطف تیر مارا ہے اور ان کو اپنا شیدا بنا لیا ہے۔

اے برادر! اپنی جستجو میں لگے رہو اور اپنے آپ کو پہچانو۔ جب تم اپنے نفس کو پہچان لوگے، تو عشق کو بھی پہچان لوگے۔ پھر عشق کو اپنے حسن پر دیکھو گے ___ عاشق ہو جاؤ اور محبوب کو اپنی آغوش میں دیکھو اور حُسن کا معائنہ اپنے دل کے آئینے میں کرو:

آن شاہدِ معنی کہ ہمہ طالبِ اویند ۔۔۔ ہم اوست کہ چادرِ تو ساختہ سرپوش

در بادیۂ ہجر چرا بند بمانیم ۔۔۔ در عینِ وصالیم نگارست در آغوش

اے برادر! قند کا ایک گولہ لاؤ۔ پھر اس سے سو گولے بنالو اور ہر گولے سے ایک صورت بناؤ اور ہر صورت کا ایک نام رکھو۔ بعض کو گھوڑا اور بعض کو ہاتھی کہو تو قند کا نام جاتا رہے گا۔ صرف صورت باقی رہ جائے گی۔ پھر جب تمام صورتوں کو توڑ کر قند کا گولہ بنالوگے، تو قند کا نام پھر سے ظاہر ہو جائے گا۔

اے برادر! یہ بات معلوم نہیں کہ ہم لوگوں کو کیوں پیدا کیا گیا اور ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ خیال ہمیشہ فکر کے ساتھ دامنگیر رہتا ہے۔ کبھی اندیشہ ہمارے آئینۂ دل کو سنوارتا ہے اور عاشق کے سامنے معشوقِ حقیقی کو ظاہر کرتا ہے اور عاشق کا وہ حکم، جو معشوق نے پہنچایا ہے، عاشق کا فرض اور سنتِ محبوبی اس کے مطالعہ سے بجالاتا ہے۔ اندیشہ عاشق کے عشق اور معشوق کے حسن سے باطن کو معمور رکھتا ہے۔ حسن کے جلوے سے عاشق اپنے ظاہر کو بھلا دیتا ہے اور اپنے باطن کے تماشے میں مصروف ہو جاتا ہے تاکہ

عاشق کا وہ حکم نافذ ہو جائے، جسے معشوق نے پہنچایا ہے۔

اے برادر! کبھی خیال نفس کا دوست بن جاتا ہے اور حال خیال کے ساتھ مل کر دنیا کی روزی کی طرف لے جاتا ہے۔ خیال دنیا کی آرائش نفس کو دکھاتا ہے اور اس کے عشق میں اس کو پریشان و خراب کرتا ہے۔ اس کو معشوق کے دروازے پر پھراتا ہے۔ ہر دروازے پر اُسے رسوا اور ذلیل کرتا ہے اور نفس کو اپنے شوقِ آرائش کی آسائش کے سبب اِس ذلّت کا احساس نہیں ہوتا اور وہ باز نہیں آتا۔ وہ ہرگز نہیں سوچتا کہ اس دنیا نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی اور نہ آئندہ کرے گی۔ نفس کو موت کی بھی فکر نہیں ہوتی، جو اچانک آکر اسے ختم کر دے گی۔ دنیا کے عاشقوں کو دنیا کی آرائش کا حسن اپنے عشق میں ایسا بے خبر کر دیتا ہے کہ نہ اُن کو اس دنیا کی کچھ خبر ہوتی ہے، جس کو انھوں نے اپنا معشوق بنا لیا ہے اور نہ ہی اس کا کچھ علم ہے کہ جب دنیا ختم ہو جائے گی، تو کیا واقعات رونما ہوں گے۔ نہ انہیں عقبیٰ کی کچھ خبر ہوتی ہے کہ سامنے کیا مہم درپیش ہے۔

اے برادر! سوچ لو کہ تمہیں بھی ایک مہم کا سامنا ہے۔ تم نے خیال اور اندیشے کو اپنا مونس بنایا ہے۔ خیال کے بارے میں جان لو کہ وہ نفس کا دوست ہے۔

اے برادر! کچھ معلوم نہیں کہ خیال اور اندیشہ کیا صورتِ حال پیدا کریں۔ جب حالات تمہارے سامنے آئیں گے، تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہی قسمت کا لکھا تھا کہ تمہارے سامنے آیا۔

اے برادر! میں کچھ نہیں جانتا کہ کیا کروں اور مجھ سے کیا کام ہو سکے گا اور کیا میری زبان سے نکلے گا۔ زبان خدا کے قبضہ میں ہے۔ اگر تم پر خدا کا فضل ہو، تو تمہاری زبان سے ایسی بات نکلے گی، جو دونوں جہانوں کو پسند ہو۔

اے برادر! صرف اتنا معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی مشیت سے تم کو پیدا کیا ہے اور وہ اپنی مرضی سے باقی رکھتا ہے۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ

(یعنی جو کچھ اس نے چاہا، وہ کیا اور جو کچھ وہ چاہتا ہے، کسی کو اُس کی مرضی میں دخل نہیں۔)

انتخاب از غزلیات

(۱)

اگر بینم شبے ناگہ من آن سلطانِ خوبان را
سرے در پایِ وے آرم، فدا سازم دل وجان را

بپرسم از رہِ یاری کہ جانان چون نہ ای آخر
کجائی کت نمی بینم دو چشمِ مست وغلطان را

فروزم آتشے در دل، بسوزم قبلۂ عالم
پس آنگہ قبلہ سازم من آن ابروی جانان را

بگوئی، این سخن کفراست، اگر گوئی شوی کافر
بروُ اے واعظِ نادان چہ دانی سِرِ مستان را

بیا، اے عاشقِ صادق، مگر چندین پذیرفتی
برو در کنجِ ویرانہ ببین آن مارِ پیچان را

بیا ساقی کہ روی تو مرا شمع حرم باشد
بگردم گِردِ میخانہ ببوسم پای مستان را

دل وجان کردہ ام نذرِ بتان، اکنون ہمی خواہم
کہ گر یابم خریدارے، فروشم جان وایمان را

ترسم ز آتشِ دوزخ، نہ پرواےِ جنان دارم
منم شوریدۂ جانان نخواہم حور و غلمان را
مشرف، بربندلب از گفتنِ اشعارِ رندانہ
شکایت ہاست از اشعارِ تو گبر و مسلمان را

(۲)

دیہیمِ خسروان برِ ما نعلِ استر است
خسرو کسے کہ خلعتِ تجرید در براست
سیمرغ وار رُوی نہفتم بہ قافِ عشق
کز ہردو کون دانۂ رُوحم نہ درخوراست
وحدت ورای کنگریاےِ کبریا کشد
کو عارفے کہ منظرِ او عرشِ اکبراست
گفتم ز علم و عقل بہ ملکے دگر شوم
ملکم ز علم و عقل چو دیدم بروں تراست
عقلِ کُل است علمِ لدنی بہ عارفان
وین علم و عقلِ حسی و درسی محقر است
عیسیٰ بہ دیرِ ما نبود جز صلیب دار
ور دعوی صفا زند راعی خر است

مائیم و کوی عشق و خرابات بے خودی
وین رسم و سیرتے ست کہ خاص قلندر است

با بوعلی بگوئی ز حرف قلندری
کز معرفت معلم قدس است واز بر است

درس شرف نبود از الواح ابجدی
لوح جمال دوست مرا او را برابر است

(۳)

اگر اسرار وحدت بیشمارہ است
نظر کردن نہ صنع کردگار است

جمال لایزالی نور در نور
بگرد آن خط و خال عذار است

تجلی در مقامات محبت
نگار اندر نگار اندر نگار است

درین دریای حیرت غرق گشتم
کہ این گوہر کدامین آبدار است

برات عاشقاں از کفر و ایمانست
بکوی عاشقان از تخت دار است

جمالِ گل که در گِل جمال است
بروحِ قدسیِ من آشکار است
شرف کم گوی اسرارِ الٰهی
درین دوران که خود اغیار یار است
طریقِ بوعلی در راهِ تجرید
کرامت با ملامت پائدار است

(۴)

جمالش را نقابے بر نتابد — خیالش را حجابے بر نتابد
بگردِ روی صد آفتاب است — که از کونین تابے بر نتابد
بجانبازی بدو نتوان رسیدن — که جان از وے خطابے بر نتابد
بچشمِ روح هم نتوان بدیدن — که خفاش آفتابے بر نتابد
چرا پروانه گردِ شمع گردد — چو زو یکدم عتابے بر نتابد
جمالش را نیاید زان خیالے — که دریا را سرابے بر نتابد
غمِ عشقت خرابے کرد جانم — خراج اندر خرابے بر نتابد
شرف هم عاشق و معشوق خود است
شکیبا شو، شتابے بر نتابد

(۵)

نہ مثلِ قامتت سروے بہ بستان جانفزا خیزد
نمائی ہمچو رخسارت بگردون دلربا خیزد

نہ پنداری کہ مہرت از دلِ عاشق رود ہرگز
چو میرد مبتلا میرد، چو خیزد مبتلا خیزد

ز بعدِ مرگِ من بینی گیا بر گورِ من رستہ
نبشتہ نامِ تو، جانان، بہ ہر برگِ گیا خیزد

ازین بالای موزونت بلاہا خاستہ ہر سو
چنین بالا کہ تو داری، ازین بالا بلا خیزد

دلم مجروحِ تیغِ غم، رقیب از دستِ من نالان
جفا بر دانۂ مسکین خروش از آسیا خیزد

شرف را گر بدارِ غم بر آری خونِ او ریزی
ہر آن قطرہ کہ از خونش چکد نقشِ وفا خیزد

(۶)

آہ در خونِ جگر می سوزدم
حسرت اندر مغز سر می سوزدم

گاہ سرگردان چو پروانہ کند
گاہ ہمچون شمع تر می سوزدم

یک نظر کردم بروی خوبِ او
تا قیامت زان نظر می سوزدم

پرتوِ شمعِ رخش بر من رسید — زان چو پروانہ جگر می سوزدم
آبِ حیوان از لبانش می چکد — آتشِ عشقش بتر می سوزدم
چون پرم اندر ہوای وصلِ او — عشقِ او چون بال و پر می سوزدم
زآتشِ ہجرِ تو در قیدِ حیات — روز و شب نارِ سقر می سوزدم
داغہای عشقِ او در دل مراست — آہ این مشتِ شرر می سوزدم
شعلۂ یادِ رُخِ پرَ نورِ او
بوعلی شام و سحر می سوزدم

(۷)

می ساقی و شاہد در کنارم — ز کس در دو جہان باکے ندارم
ازان مے کز نعمت خور دست جانم — بماند تا ابد اندر خمارم
چو چشمِ مستِ تو مستم ہمہ عمر — نخواہی دید ہرگز ہوشیارم
انا الحق می زنم صدرہ چو منصور — اگر رہ می نمائی سوی دارم
چنان شاہد کہ من دارم بہ عالم — سزد کز ہر دو عالم سر برآرم
چو از رخ می کشد بندِ نقابے — تجلی می نماید بے قرارم
کنار از دین و از دنیا گرفتم — ہنوز او می نیاید در کنارم
نگیرد گوشۂ دامانِ او را — کند پرواز، اگر مشتِ غبارم
چہ گویم، اے شرف، در حضرتِ او
کہ او داند نہان و آشکارم

(۸)

پرده بردار که تا عارضِ زیبا نگریم
ورنه از آهِ جگر پردهٔ عالم بدریم

پرده بردار که با خود سپر انداخته ایم
پیشِ شمشیرِ تو ما جمله سراسر سپریم

آتشِ روی تو خرمنِ ارواح بسوخت
لیک با ما چه توان کرد که کوته نظریم

پرتوِ روی تو خود می بدرد پردهٔ خویش
پس چرا روی ترا ما پسِ پرده نگریم

زان لطافت که جمالت ز ازل رو بنمود
روح صرف است که در وے بتماشا نگریم

با خبر کوی جمالِ تو به عالم شده ایم
گرچه از جلوهٔ دیدارِ تو ما بیخبریم

طعنهٔ دشمن و تحسینِ رفیقان شنویم
لیکن از جا نرویم و به تغافل گذریم

مرده هرگز نبود آنکه بمیرد در عشق
کشتهٔ نازِ ترا زندهٔ دائم شمریم

نیست فردوسِ برین ہمسرِ کویِ توکہ ما
راہ بکویِ تو بفردوسِ برین می بریم

بوعلی راہِ ملامت رہِ مردانِ خداست
می نشاید کہ چنین راہ بہ نفرت سپریم

(۹)

منم محوِ جمالِ او، نمی دانم کجا رفتم
شدم غرقِ وصالِ او، نمی دانم کجا رفتم

غلامِ رویِ او بودم، اسیرِ مویِ او بودم
غبارِ کویِ او بودم، نمی دانم کجا رفتم

بآن مہ آشنا گشتم زجان و دل فدا گشتم
فنا گشتم، فنا گشتم، نمی دانم کجا رفتم

شدم چون مبتلایِ او، نہادم سر بپایِ او
شدم محوِ لقایِ او، نمی دانم کجا رفتم

قلندر بوعلی ہستم، بنامِ دوست سرمستم
دل اندر عشقِ او بستم، نمی دانم کجا رفتم

(۱۰)

دانی کہ چیست دنیا، دل از خدا بریدن
جز عشقِ او گزیدن، جز ذکرِ او شنیدن

دانی کہ چیست مستی در عشقِ نازنینان

هم دست و پا فشاندن، هم پیرہن دریدن

دانی کہ چیست لذت در عهدِ زندگانی

بوی سرش شنیدن، لعلِ لبش چشیدن

دانی کہ چیست لازم آن شوخِ نوجوان را

چون گُل بخندہ بودن، چون سروِ نو چمیدن

دانی کہ چیست مقصد از عشق عاشقان را

هم سوی یار رفتن، هم روی یار دیدن

دانی کہ چیست مطلب از عشقِ تو شرف را

نشتر بہ دل شکستن، از دیدہ خون چکیدن

(۱۱)

اے ثنایت رحمۃ للعالمین | یک گدای فیضِ تو روح الامین
اے کہ نامت را خدای ذوالجلال | زد رقم بر جبہۂ عرشِ برین
آستانِ عالی تو بے مثل | آسمانے ہست بالای زمین
آفرین بر عالمِ حسنِ تو باد | مبتلای تست عالم آفرین
یک کفِ خاک از درِ پُر نورِ او | ہست مارا بہتر از تاج و نگین
خرمنِ فیضِ ترا ، اے ابرِ فیض | هم زمین و هم زمان شد خوشہ چین

از جمالِ تو ہمی بینیم ما جلوۂ در آئینہ عین الیقین
خلق را آغاز و انجام از تو ہست اے امامِ اوّلین و آخرین
غیرِ صلوات و سلام و نعتِ تو
بوعلی را نیست ذکرِ دلنشین

(۱۲)

صد غم بیازم در غمت ہرگز نیارم داوری
جان خود چہ باشد در بدن جان را تو جانِ دیگری
ہرگز ندیدم بے نشان نورِ جمالش بے گمان
گہ در خدائی شد عیان، گہ در بتانِ آذری
در دیرِ ترسایان برو، نقش از بتِ آذر بشو
بر صورتت بندہ گرو، اے کد خدایِ پیکری
من چون جمالت بنگرم، وہم خدائی می برم
گر مؤمنم ور کافرم، واللہ کزین ہم برتری
جعدت کمندِ روشنم کز حلقہ ہایِ خم بہ خم
ابلیس و آدم کردہ دم در دے برسم داوری
چند انکہ می دارم ہوس، سویت ندارم دسترس
می بینمت بادے زبس، می دانمت بیش از پری

از ابروی محراب ہا، بر باد دادہ آب ہا
عیسیٰ در آن خوناب ہا ترسان باخلاص آوری

عرش برین ایوانِ تو روح الامین دربانِ تو
عالم بر دفرمانِ تو، تو جملہ عالم را سری

زین چہرۂ زیبای تو زین قامتِ رعنای تو
ہمچو شرف شیدای تو حور و ملک جن و پری

مآخذ و مراجع

۱۔ آثار الصنادید	سر سید احمد خان	لکھنؤ	۱۲۹۳ھ
۲۔ آئینِ اکبری	ابو الفضل مبارک	دہلی	۱۲۷۳ھ
۳۔ اخبار الاخیار	شیخ عبد الحق محدث دہلوی	دہلی	۱۳۰۹ھ
۴۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبد الحق	کراچی	۱۹۵۳ء
۵۔ اذکار الابرار	مولوی محمد تقی حیدر	لکھنؤ	۱۹۳۸ء
۶۔ ارمغانِ پاک	شیخ محمد اکرام	کراچی	۱۹۵۳ء
۷۔ ارمغانِ حجاز	علامہ محمد اقبال	لاہور	۱۹۶۶ء
۸۔ ارمغانِ ہند	سید لطف علی شاہ	حیدرآباد دکن	۱۸۹۳ء
۹۔ اصول المقصود	تراب علی	لکھنؤ	۱۹۰۴ء
۱۰۔ انتصاح	علی انور قلندر	تہران	۱۸۷۷ء
۱۱۔ انوارِ صوفیہ	محمد لطیف آفریدی	لاہور	۱۸۵۸ء
۱۲۔ انوارِ صوفیہ	محمد لطیف ملک	لاہور	۱۹۶۷ء
۱۳۔ بالِ جبریل	علامہ محمد اقبال	لاہور	۱۹۵۱ء

۱۴۔ برہانِ قاطع	محمد حسین تبریزی	تہران	۱۳۳۲-۳۳ھ ش
۱۵۔ بزمِ صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	اعظم گڑھ	۱۹۴۹ء
۱۶۔ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت	مولانا سید محمد میاں	پانی پت۔ بعد از	۱۹۶۳ء
۱۷۔ پریچنگ آف اسلام	آرنلڈ	لاہور	ندارد
۱۸۔ تاریخ فیروز شاہی	سراج عفیف	کلکتہ	۱۸۹۰ء
۱۹۔ تاریخ فیروز شاہی اردو ترجمہ	ضیاء الدین برنی	لاہور	۱۹۶۹ء
۲۰۔ تاریخ نظامی	سید ضامن نظامی	دہلی	ندارد
۲۱۔ تحفۃ الکرام	میر علی شیر قانع	دہلی	۱۹۰۲ء
۲۲۔ تذکرۃ الشعراء	عبدالغنی خاں غنی	علیگڑھ	۱۹۱۶ء
۲۳۔ تذکرۂ غوثیہ	شاہ گل حسن قادری	لاہور	ندارد
۲۴۔ تذکرہ اولیائے کرام	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	لاہور	۱۹۵۵ء
۲۵۔ تذکرہ اولیائے ہند	محمد اختر	دہلی	۱۹۵۰ء
۲۶۔ تذکرۂ حسینی	میر حسین دولت سنبھلی	لکھنؤ	۱۸۸۱ء
۲۷۔ تذکرہ شعرائے پنجاب	عبدالرشید	کراچی	۱۹۶۷ء
۲۸۔ تذکرہ صوفیائے سندھ	اعجاز الحق قدوسی	کراچی	۱۹۵۸ء
۲۹۔ تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمان علی	لکھنؤ	۱۹۱۴ء
۳۰۔ تقویم تاریخی	عبدالقدوس ہاشمی	کراچی	۱۹۶۵ء

۳۱۔ تہذیب کی کہانی	انور ہاشمی	کراچی	۱۹۶۸ء
۳۲۔ ٹرتھ ورشپرز (TRUTH WORSHIPPERS)	ایوانو (IVONOW)	لندن	ندارد
۳۳۔ جامع التواریخ	قاضی فقیر محمد	لکھنؤ	۱۸۷۱ء
۳۴۔ حضرت شیخ شرف الدین مع دیوان (مقالہ)	ذوالفقار علی لودھی		(کتابخانہ دانشگاہ پنجاب، خطی)
۳۵۔ حضرت لال شہباز قلندر (اردو ترجمہ)	پروفیسر قاضی	لاہور	۱۹۷۲ء
۳۶۔ حضرت نظام الدین اولیاء	اقبال صلاح الدین	لاہور	۱۹۷۱ء
۳۷۔ خزینۃ الاصفیاء	مفتی غلام سرور لاہوری	کانپور	۱۹۱۴ء
۳۸۔ خسرو شیریں زبان	اقبال صلاح الدین	لاہور	۱۹۷۰ء
۳۹۔ خیابانِ عرفان	سید محمد محسن بلگرامی	لکھنؤ	۱۹۲۴ء
۴۰۔ دعوتِ اسلام	عنایت اللہ	کراچی	۱۹۶۱ء
۴۱۔ دیوانِ احمد جام	حضرت احمد جام	لاہور	ندارد
۴۲۔ دیوانِ بوعلی قلندر	حضرت بوعلی قلندر	لاہور	ندارد
۴۳۔ راہنمای ادبیاتِ فارسی	زہرای خانلری	تہران	ندارد
۴۴۔ رباعیاتِ قلندر	حضرت بوعلی قلندر	لاہور	ندارد
۴۵۔ ریاض العارفین	رضا قلی خان ہدایت	تہران	۱۸۸۷ء

۴۶۔ بستر دلبران	شاہ سید محمد ذوقی	کراچی	۱۳۸۸ء
۴۷۔ سفینۃ الاولیاء	محمد داراشکوہ قادری	آگرہ	۱۸۸۴ء
۴۸۔ سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات	خلیق احمد نظامی	دہلی	۱۹۵۸ء
۴۹۔ سوانح حیات حضرت لال شہباز قلندر	احمد پیلی بھیت	کراچی	۱۹۷۰ء
۵۰۔ سیرالاقطاب	اللہ دیا چشتی عثمانی	لکھنؤ	۱۹۱۲ء
۵۱۔ شرف المناقب	شیخ محمد بن احمد	دہلی	ندارد
۵۲۔ عوارف المعارف (اردو ترجمہ)	عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی	لاہور	۱۹۶۲ء
۵۳۔ عہدِ اسلامی کا ہندوستان	سید ریاست علی ندوی	پٹنہ	۱۹۵۰ء
۵۴۔ فرہنگِ آنند راج	محمد بادشاہ	تہران	۱۳۳۵ھ ش
۵۵۔ فہارس اورنٹیل کالج میگزین	ڈاکٹر محمد بشیر حسین	لاہور	۱۹۷۰ء
۵۶۔ قصرِ عارفاں	مولوی احمد علی	لاہور	۱۹۶۶ء
۵۷۔ کتاب الاعراس	محمد نجیب قادری	لاہور	۱۸۸۲ء
۵۸۔ گلزارِ اولیاء	رئیس احمد جعفری	لاہور	ندارد
۵۹۔ مثنوی اسرارِ خودی	علامہ محمد اقبال	لاہور	۱۹۶۶ء
۶۰۔ مثنوی شاہ بوعلی قلندر	حضرت بوعلی قلندر	لکھنؤ	۱۳۱۳ھ
۶۱۔ محفل الاصفیاء و مجمع الاولیاء	علی اکبر اردستانی	(کتابخانہ دانشگاہ پنجاب) خطی	

۶۲۔ مردِ ابدالی	سردار محمد یعقوب خاں	لائل پور	ندارد
۶۳۔ مسالک السالکین	مرزا عبدالستار بیگ	(کتاب خانہ دانشگاہِ پنجاب)	خطی
۶۴۔ مفتاح الغیب	عطا نظامی و مظہر نظامی	سیالکوٹ	۱۹۳۳ء
۶۵۔ مناقب الاصفیاء	شیخ شعیب فردوسی	کلکتہ	۱۸۸۵ء
۶۶۔ نزہۃ الخواطر	عبدالحئی	حیدرآباد (دکن)	۱۹۵۰ء
۶۷۔ نفحات العنبریہ من انفاس			
۶۸ القلندریہ	مولوی محمد تقی حیدر	لکھنؤ	۱۳۳۱ھ
۶۹۔ ہفت اقلیم	امین احمد رازی	کلکتہ	۱۹۲۷ء
۷۰۔ ہند اور پاکستان کے اولیاء	شوکت علی فہمی	دہلی	۱۹۵۱ء
ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	اعظم گڑھ	۱۹۵۸ء

